VOLUME X NUMBER 2 | JULY 1975 & JANUARY 1976 | VOLUME XI NUMBER 1

JOURNAL OF RESEARCH

[HUMANITIES]

Edited by Siraj-ud-Din

UNIVERSITY OF THE PUNJAB
LAHORE

EDITORIAL BOARD

Chief Editor

Siraj-ud-Din, Professor Emeritus, Department of English Language and Literature, University of the Punjab.

Members

A Waheed Qureshi, Professor and Chairman, Department of Urdu, Oriental College, University of the Punjab.

Munir-ud-Din Chughtai, Professor and Chairman, Department of Political Science, University of the Punjab.

Dr. Zahur Ahmad, Assistant Professor and Chairman, Department of Arabic, Oriental College, University of the Punjab.

Muhammad Aslam, Associate Professor and Chairman, Department of History, University of the Punjab.

Kh. Ghulam Sadiq, Associate Professor and Chairman, Department of Philosophy, University of the Punjab.

Dr. Rafiq Ahmed, Professor, Department of Economics, University of the Punjab.

Kh. Amjad Saeed, Associate Professor and Chairman, Department of Business Administration, University of the Punjab.

Bashir Ahmad Siddiqui, Assistant Professor and Chairman, Department of Islamic Studies, University of the Punjab.

Waris Mir, Assistant Professor and Chairman, Department of Journalism, University of the Punjab.

Secretary

Muhammad Ismail Bhatti, Assistant Professor, Department of English, University of the Punjab.

VOLUME X NUMBER 2 — JULY 1975 & JANUARY 1976 — VOLUME XI NUMBER 1

JOURNAL OF RESEARCH

[HUMANITIES]

Edited by Siraj-ud-Din

UNIVERSITY OF THE PUNJAB
LAHORE

CONTENTS

			Page
I.	اقبال کا اسلوب نگارش	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار	1
II.	ARMS SALES AND THE OIL CRISIS	*Akmal Hussain*	41
III.	THE IMPORTANCE OF STRESS IN SCANNING ENGLISH POETRY	*Iftikhar Ahmad*	57
IV.	THE SCIENTIFIC METHODOLOGY IN ISLAM	*Dr. Amanullah Khan*	67
V.	NATIONAL LANGUAGE POLICIES AND STANDARD OF ENGLISH IN PAKISTAN	*Muhammad Ismail Bhatti*	81

CONTRIBUTORS

1. Dr. Ghulam Hussain Zulfiqar, Associate Professor and Chairman, Department of Urdu, Oriental College, University of the Punjab.
2. Syed Akmal Hussain, Assistant Professor, Department of Administrative Science, University of the Punjab.
3. Iftikhar Ahmad, Chairman, Department of English Language and Literature, University of the Punjab.
4. Dr. Amanullah Khan, Chairman, Department of Islamic Studies, University of the Punjab.
5. Muhammad Ismail Bhatti, Assistant Professor, Department of English Language and Literature, University of the Punjab.

اقبال کا اسلوب نگارش

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

زیر نظر مضمون میں اقبال کی اردو نثر کا فنی مطالعہ مقصود ہے۔ اقبال نے اردو میں شاعری بھی کی اور نثر بھی لکھی۔ بعد میں اردو کے علاوہ فارسی کو بھی شاعری میں ذریعۂ اظہار بنایا اور مضامین و خطبات و خطوط انگریزی میں بھی لکھے (جنہیں بعد میں دوسرے لوگوں نے اردو میں ترجمہ کیا) موجودہ مطالعے میں صرف ان نثری تحریروں کو پیش نظر رکھا گیا ہے جو اقبال نے اردو میں لکھیں۔ ان نگارشات میں ان کی تصنیف ''علم الاقتصاد''، مکاتیب کے مجموعے ''اقبالنامہ'' (حصہ اول و دوم)، ''مکاتیب اقبال'' (بنام گرامی) ''مکتوبات اقبال'' (بنام سید نذیر نیازی)، ''مکاتیب اقبال'' (بنام نیاز الدین خان) اور ان کے متفرق مضامین و مکاتیب و بیانات کے مجموعے ''گفتار اقبال'' (مرتبہ محمد رفیق افضل) ''مقالات اقبال' (مرتبہ سید عبدالواحد) ''انوار اقبال'' (مرتبہ بشیر احمد ڈار) شامل ہیں۔

اقبال کا مطالعہ زیادہ تر ان کے شعری افکار و اسلوب تک محدود رہا ہے۔ نثری تحریریں اگر زیر بحث آئی بھی ہیں تو اپنے مدعا و مطالب کی بنا پر آئی ہیں، ان کے اسلوب پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی نثر بھی فن انشاء کے اعتبار سے اپنا ایک خاص انداز رکھتی ہے اور شعری اسلوب کے ساتھ ساتھ ان کی نثر کا لہجہ بھی منفرد اور اتنا بے ساختہ اور باوقار ہے کہ اردو نثر کی تاریخ میں اس کی ماہیت اور قیمت کی تعیین از بس ضروری ہے۔

اہل پنجاب کی یہ عجیب حالت ہے کہ وہ صدیوں سے اردو زبان میں شعر اور نثر لکھ رہے ہیں لیکن زبان دانی کے معاملے میں خاصے محجوب

اور عذر خواہ واقع ہوئے ہیں - زمانہ قدیم میں تو اس کی یہ وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ اسلامی عہد میں دہلی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور مرکز کے معیار کی پیروی ہر طرف ضروری سمجھی جاتی تھی - لیکن اردو اور پنجاب کے قدیم لسانی رشتوں کی دریافت اور گزشتہ صدی سے پنجاب کے ایک تہذیبی، تعلیمی، علمی اور ادبی مرکز بن جانے اور اردو کی طباعت و اشاعت میں لاہور کو برصغیر میں مرکزی حیثیت حاصل ہو جانے کے بعد بھی پنجاب کے اکثر اہل قلم کو زبان کے معاملے میں عذر خواہی کی ضرورت محسوس ہوتی رہی - اقبال کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے - وہ اردو زبان کے بارے میں اسی محجوب روش پر گامزن رہے - اردو سے اپنے لگاؤ کو وہ اسلام سے محبت کے بعد دوسرا اہم درجہ دیتے ہیں - لیکن جب اردو میں رواں دواں شاعری کرتے ہیں اور بے ساختہ انداز میں پر معنی نثر لکھتے ہیں تو اپنی زباندانی کے بارے میں ساتھ ہی یہ عذر خواہی بھی کرتے ہیں :

''اگرچہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا''۔

(اقبالنامہ ، حصہ اول، ص ۷۸)

''میں تو اردو زبان کا ماہر نہیں اور بالخصوص گرامر سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں'' -

(انوار اقبال، ص ۲۹۳)

''اردو میں گفتگو کرتے ہوئے میں اپنے ما فی‌الضمیر کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا'' ۱-

(اقبالنامہ، حصہ اول، ص ۴۷)

۱- اگرچہ یہ فقرہ انھوں نے جس سیاق میں کہا ہے وہ قابل غور ہے - اس سے ان کے اسلوب کے جائزے میں بھی مدد مل سکتی ہے - فرماتے ہیں :
"میری عمر زیادہ تر فلسفے کے مطالعے میں گزری ہے اور یہ نقطۂ خیال ایک حد تک طبیعت ثانیہ بن گیا ہے - دانستہ یا نادانستہ میں اسی نقطہ نگاہ سے حقائق اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں اور مجھ کو بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے کہ اردو میں گفتگو کرتے ہوئے میں اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا "-

شاید یہ عذر خواہی کچھ اس لیے ہو کہ ''اہل زبان' حضرات کی طرف سے ایک زمانے میں اقبال کے اردو کلام پر جا بجا زبان کے اعتراضات کیے گئے تھے جس کا انھوں نے اپنے ایک مضمون ''اردو زبان پنجاب میں'' (مطبوعہ مخزن ۱۹۰۲ء) میں جواب بھی دیا تھا اور اس میں بعض ایسے نکتے بھی اٹھائے تھے جو لسانی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہیں - اقبال کشمیری نژاد پنجابی تھے - وہ پنجابی بولتے تھے، اردو لکھتے تھے اور ان کے لیے اہل پنجاب کے نظریئے کے مطابق ان دونوں زبانوں میں کوئی بعد اور مغائرت نہ تھی - یہ قدرتی امر ہے کہ وہ محاورات میں ''اہل زبان'' کے پابند نہیں ہو سکتے تھے اور ان کا روزمرہ اپنے ماحول سے بیگانہ نہیں ہو سکتا تھا - اس لیے کہ وہ زبان کے معاملے میں زیادہ حقیقت پسند واقع ہوئے تھے - اسی روش نے ان کے نثری اسلوب میں انفرادیت پیدا کی - زبان کے بارے میں اقبال کا یہ شعور کتنا سائنٹفک (عقلی) ہے :

''جو زبان ابھی زبان بن رہی ہو اور جس کے محاورات و الفاظ جدید ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً اختراع کیے جا رہے ہوں اس کے محاورات وغیرہ کی صحت و عدم صحت کا معیار قائم کرنا میری رائے میں محالات سے ہے - ابھی کل کی بات ہے ، اردو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں تک محدود تھی - مگر چونکہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادہ تھا اس واسطے اس بولی نے ہندوستان کے دیگر حصوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کیا اور کیا تعجب ہے کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے زیر نگین ہو جائے - ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اس کا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت، ان کے تمدنی حالات اور ان کا طرز بیان اس پر اثر کیے بغیر رہے - علم السنہ کا یہ ایک مسلم اصول ہے جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی

تاریخ سے واضح ہوتی ہے۔ اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے۔ تعجب ہے کہ میز، کمرہ، کچہری، نیلام وغیرہ اور فارسی اور انگریزی کے محاورات کے لفظی ترجمے کو بلا تکلف استعمال کرو، لیکن اگر کوئی شخص اپنی اردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ یا کوئی پر معنی پنجابی لفظ استعمال کر دے تو اس کو کفر و شرک کا مرتکب سمجھو۔ اور باتوں میں اختلاف ہو تو ہو مگر یہ مذہب منصور ہے کہ اردو کی چھوٹی بہن یعنی پنجابی کا کوئی لفظ اردو میں گھسنے نہ پائے۔ یہ قید ایک ایسی قید ہے جو علم زبان کے اصولوں کے صریح مخالف ہے اور جس کا قائم و محفوظ رکھنا کسی فرد بشر کے امکان میں نہیں ہے۔ اگر یہ کہو کہ پنجابی کوئی علمی زبان نہیں ہے جس سے اردو الفاظ و محاورات اخذ کیے جائیں تو آپ کا عذر بیجا ہوگا۔ اردو ابھی کہاں کی علمی زبان بن چکی ہے جس سے انگریزی نے کئی ایک الفاظ بدمعاش، بازار، لوٹ، چالان، وغیرہ لے لیے ہیں اور ابھی روز بروز لے رہی ہے''۔

(مقالات اقبال، ص ۲۰، ۲۱)

یاد رہے اردو میں برہمنیت کے رجحان پر یہ ضرب کاری اقبال نے آج سے پون صدی پیشتر لگائی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد اردو وادی سندھ کے ماحول میں بالکل فطری انداز میں نشو و ارتقا کے نئے مراحل سے گزر رہی ہے اور اقبال کا متذکرہ بالا لسانی تجزیہ کتنا ٹھوس اور حقیقی ثابت ہو رہا ہے۔

ذیل کے اقتباسات میں اقبال نے ایک زندہ زبان کی نشو و نما کے بارے میں جو موقف پیش کیا ہے وہ علمی لحاظ سے حقیقت پسندانہ ہونے کے علاوہ اقبال کی زبان دانی اور لسانی اعتبار سے اردو زبان کی بحیثیت

زندہ زبان ان کی بیش بہا خدمت کو بھی ظاہر کرتا ہے:

''زبان کو میں ایک بت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے، بلکہ اظہار مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے۔ ہاں ترکیب کے وضع کرنے میں مذاق سلیم کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے''۔

(اقبالنامہ، حصہ اول، ص ۵۶)

''زبانیں اپنی اندرونی قوتوں سے نشو و نما پاتی ہیں اور نئے خیالات و جذبات کے ادا کر سکنے پر ان کی بقا کا انحصار ہے''۔

(اقبالنامہ، حصہ دوم، ص ۸۵)

اقبال کے اسلوب نگارش کا جائزہ لیتے ہوئے زندہ زبان کی ہر لحظہ نشو و نما کے بارے میں ان کے اس شعور کو مد نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ اور یہ حقیقت بھی واضح رہنی چاہیے کہ اقبال اردو کو ایک زندہ زبان سمجھتے تھے، اسے ماضی کے کسی درخشاں دور کی علامت یا کسی قدیم تہذیبی مرکز کی قابل فخر یادگار نہیں سمجھتے تھے کہ اسے سجا بنا کر کسی عجائب گھر کی زینت بننے دیں۔

اسلوب کے مطالعے میں مصنف کے نفسیاتی محرکات، تعلیم کے مراحل، زمانے کے رجحانات اور اسلوب کے ارتقائی سلسلوں کے علاوہ کچھ اور عوامل بھی انجانے طور پر اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ اقبال کے نثری اسلوب کے مطالعے میں ان باتوں کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ اقبال کی طالب علمی کے زمانے میں جدید تعلیم کے حصول اور مغربی علوم کے مطالعے کا سلسلہ تیزی سے ملک میں پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ پچھلی نسل کے اہل قلم جو اس زمانے میں مجلس علم و ادب کے صدر نشین تھے، اردو زبان کے قدرتی سرچشموں عربی، فارسی، سنسکرت سے واقف تھے (اگرچہ

سنسکرت ایک مردہ زبان کی حیثیت سے برہمنوں کے ایک حلقے تک محدود تھی) ۔ وہ مغربی علوم اور زبانوں کے چرچے تو سنتے تھے لیکن ان سے انہیں آگاہی حاصل نہیں تھی ۔ نئی نسل جو اقبال کے ساتھ مصاف زندگی میں نکلی، مغربی زبانوں اور ان کے علوم سے آگاہی کے علاوہ مشرقی زبانوں اور ان کے علوم سے بھی قریب تھی، اس لیے قدرتی طور پر اس کے افکار اور اسلوب میں ایک نیا رنگ ظاہر ہوا ۔ اسی رنگ کو بعض حضرات اردو میں رومانی نثر کا آغاز کہتے ہیں ۔ اس رومانی انداز میں مشرق و مغرب کے بہت سے رنگ ملے ہوئے تھے ۔ اقبال نے مشن سکول و کالج سیالکوٹ اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی ۔ تعلیم کے دوران میں انگریزی کے علاوہ عربی ان کا خاص مضمون تھا اور بی ۔ اے تک انہوں نے عربی زبان میں اچھا خاصا درک حاصل کر لیا تھا ۔ فارسی زبان انہوں نے سکول و کالج میں تو نہیں پڑھی لیکن اپنے طبعی شوق سے سیالکوٹ کے مدرسوں میں جا کر اس میں بھی خاصی استعداد پیدا کر لی جو آگے چل کر ان کی فارسی شاعری کے لیے سند ثابت ہوئی ۔ نثر میں بھی عربی و فارسی کی اس استعداد کا اثر خاصا ہوا ، خصوصاً علمی مطالب کے ادا کرنے کے لیے جب اقبال کو تراکیب وضع کرنے کی ضرورت پیش آئی تو عربی و فارسی کے مذاق سلیم نے بھی اپنا جلوہ دکھایا ۔ اعلی تعلیم کے لیے اقبال نے فلسفے کا مضمون چنا، تاریخ سے بھی انہیں بڑی دلچسپی تھی اور قانون بھی ان کا موضوع تھا ۔ ان مضامین کے مطالعے نے ان کے ذہن کو حقائق علمی کے ادراک اور پھر ان کے راست اظہار کے اعتبار سے ایک خاص سانچے میں ڈھالا ۔ رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد اقبال تین سال تک پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں مصروف رہے ۔ اس دوران میں انہوں نے تاریخ، فلسفہ اور علم الاقتصاد کے موضوعات پر ٹھوس

علمی انداز میں مضامین لکھے ۔ تالیف و ترجمے کے اس سلسلے میں ان کے خاص کام یہ تھے :

(۱) تاریخ کے موضوع پر Stubbs کی تصنیف Early Plantagenents کا اردو میں تلخیص و ترجمہ ۔

(۲) علم الاقتصاد کے موضوع پر واکر Walker کی تصنیف Political Economy کا اردو میں تلخیص و ترجمہ ۔

(۳) علم الاقتصاد (تالیف) ۔

پہلے دونوں تراجم کا صرف تذکرہ کالج کی رپورٹوں میں ملتا ہے، ان کے مسودے معلوم نہیں کیا ہوئے ۔ البتہ تیسری تالیف، جو بقول اقبال کسی خاص انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کے مضامین مشہور و مستند کتب سے اخذ کر کے ان میں بعض جگہ اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کیا گیا ہے جہاں انہیں اپنی رائے کی صحت پر پورا اعتماد تھا ، اس وقت تک دو بار چھپ چکی ہے ۔ ان تالیفات و تراجم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اقبال کو شروع ہی میں اردو نثر کے سلسلے میں جو کام کرنا پڑا، وہ ٹھوس علمی نوعیت کا تھا جو اس منصب (میکلوڈ عربک ریڈر) کے فرائض میں شامل تھا ۔ شدید جذبات کا اظہار وہ اس زمانے میں اپنی اردو شاعری میں کر رہے تھے ۔ اس منصبی فریضے (نثر نگاری) میں جذبات کا دخل کم سے کم تھا ۔ اس تربیت و ریاضت کا اثر اسلوب نگارش پر ہونا قدرتی امر تھا ۔ چنانچہ اقبال کی شاعری اور نثر کے اسالیب نے شروع ہی سے جدا جدا راہیں اختیار کر لی تھیں ۔ اس لیے یہ کہنا کہ ''اقبال کو اپنے حالات کی بنا پر اردو نثر لکھنے کا اتفاق شاذ و نادر ہی ہوتا تھا لیکن بعض اوقات وہ نثر میں بھی شاعری کیا کرتے تھے'' (مرتب ''اقبال نامہ'' شیخ عطاء اللہ، حصہ دوم، صفحہ ۳۸) درست نہیں ہے ۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ تدریس کا کام بھی اقبال کے منصبی فرائض میں شامل تھا ۔ یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر اقبال

گورنمنٹ کالج لاھور میں فلسفے کے استاد مقرر ھوئے - طلبه کے سامنے مطالب کی وضاحت کا بے لاگ علمی انداز اختیار کرنا ایک ذمے دار استاد کے لیے ضروری ھوتا ھے - اس طریق کار کا اثر استاد کی تحریروں پر بھی لازماً پڑتا ھے - اقبال اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں - ان کی آئندہ تحریروں میں بھی حقائق علمیه کا اظہار اور مطالب کی وضاحت بڑے نمایاں اوصاف ھیں جن کے پیدا کرنے میں اس ابتدائی دور کی تحقیقی اور تدریسی ذمے داریوں نے اھم حصه لیا ھے -

اقبال کے عہد میں نثری اسالیب کے ارتقا پر نظر ڈالی جائے تو اس زمانے کے ایک طرف سر سید، حالی، شبلی، نذیر احمد اور آزاد کی قائم کردہ علمی و ادبی روایت ملتی ھے اور اس کے متصل رومانی نثر نگاروں کا سلسله شروع ھو جاتا ھے جو اقبال کے معاصر بھی ھیں - سر سید احمد خان نے اردو نثر کو اجتماعی مقاصد زندگی کے اظہار کا وسیله بنا کر اس میں مدعا نگاری اور بیان کی بے ساختگی پر بڑا زور دیا - ان کے رفقاء نے اس امر میں ان کا ساتھ دیا اور اپنے اپنے انداز میں معاشرتی، تہذیبی، مذھبی، اخلاقی، تعلیمی مسائل کو عقلی انداز میں پیش کیا اور جذبے اور تخیل سے حتی الوسع گریز کیا - اس عقلی گرفت سے نثر میں افادیت تو خوب پیدا ھوئی لیکن اسلوب سے بے اعتنائی کی وجه سے ان لوگوں کی نثر لطافت و دلکشی سے محروم ھو گئی - اس امر میں سرسید اور رفقائے سر سید کی درجه بندی کی جا سکتی ھے - سرسید تو عبارت کے حسن کو بالکل ھی نظر انداز کر گئے (ماسوا چند مضامین میں که جو انھوں نے نسبتاً سکون و اطمینان کے ساتھ لکھے) حالی اپنے مرشد سے قدرے بہتر ھیں که عبارت کے حسن پر بھی ان کی نظر رھتی ھے اور شاعرانه ابہام ان کی منطقی خشک بیانی پر کبھی کبھی سایه فگن ھو کر فرحت افزا بن جاتا ھے - نذیر احمد محاورے کے ذریعے منطق کی سنگلاخ سرزمین میں کچھ پھول کھلا لیتے ھیں - نیز ان کے ناولوں کا قصه پن اور گھریلو

زندگی کے نقشے دلچسپ ھوتے ھیں - شبلی نے علمی مطالب کو بیان کی لطافت و شیرینی سے بہت خوشگوار بنا دیا - اگرچه استعارے اور مبالغے کی کثرت نے جوش بیان کے ساتھ مل کر ان کے علمی بیانات کو حقائق کے اعتبار سے کہیں کہیں مجروح بھی کیا ھے تاھم یه صورت شبلی کی تحریروں میں ھر جگه نہیں ھوتی - حشو و زوائد کی ھر صورت سے گریز کر کے کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ مطالب کو سمونے کی روش نے شبلی کے انداز میں ایجاز کی جو شکل اختیار کی وہ عالمانه طرز بیان کے لیے بہت اھم ھے - آزاد کی دنیا ھی اور تھی - وہ اپنے زمانے میں رھتے ھوئے بھی تخیل کے شہپروں پر سوار ھو کر خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں پہنچ جاتے ھیں - رنگین استعارے، لفظی صنائع اور تلازمات انہیں بہت مرغوب ھیں - تاھم سلاست اور رنگینی کا امتزاج ان کی نثر کا رنگ خاص ھے جو قصے کہانیوں کے لیے بہت موزوں ھے اور اس اعتبار سے وہ سرسید کے دبستان نثر سے بالکل جدا اور کسی حد تک رومانی نثر نگاروں کے پیش رو کہے جا سکتے ھیں - جہاں تک علمی موضوعات کے بیان میں بے ساختگی، سلاست اور لطافت پیدا کر کے علمی و ادبی اسلوب کو ھم آھنگ کرنے کا تعلق ھے اس دور کے نثر نگاروں میں شبلی کا مرتبه سب سے اونچا ھے اور اس دور کے بعد آنے والے رومانی دور کے نثر نگار (جن کے ھاں علم اور ادب دونوں یکجا ھیں) شبلی کے انداز سے زیادہ متاثر ھوئے - اقبال کا شمار بھی انھی نثر نگاروں میں ھوتا ھے - ''علم الاقتصاد'' کے مسودے کو شبلی کی خدمت میں به نظر اصلاح پیش کرنا اور شبلی کا اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق مشورے دینا، کچھ بلا سبب نہیں تھا -

اسلوب نگارش کے مطالعے میں ایک اھم مسئله موضوع کا بھی ھوتا ھے - جذبه، احساس، فکر، تخیل، یه سب امور اور شعور اور لاشعور کی کیفیتیں اپنی اپنی جگه اسلوب پر اثر انداز ھوتی ھیں لیکن موضوع کی

نوعیت بھی لب و لہجے کو متعین کرنے میں بڑا حصہ لیتی ہے ۔ اگر موضوع خالص جذباتی اور تاثراتی ہو گا تو اسی اعتبار سے لاشعور کی قوتیں بیدار اور اسلوب پر تخیل کی گرفت مضبوط ہو گی اور اگر موضوع عقلی ہو گا تو اس کی رعایت سے شعور و ادراک کا غلبہ ہوگا اور تخیل کا عنصر بھی کم سے کم تر ہو جائے گا ۔ مثلاً شبلی کی تحریروں میں جن خاص عناصر کو ان سے منسوب کیا جاتا ہے (اور جو واقعۃً ان کے مزاج کا لاینفک حصہ ہیں) ان کو اگر شبلی کی تصانیف ''الکلام'' اور ''علم الکلام'' میں دیکھا جائے تو یہاں یہ عناصر بہت کم نظر آئیں گے ۔ یہاں شبلی بڑے صبر و سکون کے ساتھ علمی نکات کی گرہیں کھولتے اور تشفی بخش طریقے سے عقلی دلیلوں کے ساتھ قاری کو قائل کرتے نظر آئیں گے ۔ یہ شبلی اس شبلی سے بہت مختلف ہوں گے جو شعرالعجم، موازنہ انیس و دبیر اور اپنی تاریخی سوانح عمریوں میں جوش جذبات کے عالم میں استعاروں اور مبالغوں کے بے محابا استعمال پر اتر آتے ہیں ۔ سیرت النبیؐ میں جذبہ بھی موجود ہے اور ساتھ ہی احساس ذمے داری بھی عناں گیر ہے ، اس لیے یہاں بھی متانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ۔ غرضیکہ موضوع بھی اسلوب کا رخ متعین کرنے میں اہم حصہ لیتا ہے ۔ موضوع کی مناسبت ہی سے بیانیہ، وصفیہ، استدلالی، تشریحی و توضیحی صورتیں اسلوب میں پیدا ہوتی ہیں ۔ چونکہ اقبال کی اردو نثر کے موضوعات مختلف ہیں ، اس لیے اسلوب کی بھی متنوع صورتیں ان کی تحریروں میں جلوہ گر نظر آئیں گی جن کے تنوع میں وہ عناصر بھی شامل ہوں گے جو ان کے مزاج کا حصہ تھے ۔ اسلوب کی یہ نیرنگی مکاتیب میں تو اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے کیونکہ یہاں اسلوب کا لب و لہجہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان تعلقات کی نوعیت کے علاوہ ان مطالب و موضوعات سے بھی متعین ہو گا جو خط کی تحریر کا باعث ہوئے ۔ اقبال کے مکتوب الیہم کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان میں کئی طرح کے

لوگ شامل ہیں ۔ اس لیے اسلوب کا مسئلہ یہاں اور بھی نازک ہو جاتا ہے اور اگر یہ امر بھی پیش نظر رکھا جائے کہ اقبال خطوط اکثر قلم برداشتہ لکھتے تھے اور ان کی تحریر چونکہ مختلف تقاضوں سے (علمی سے لے کر معاملاتی اور کاروباری) ہوتی تھی اس لیے ضروری نہیں کہ یہ تحریریں کسی اطمینان و فراغت کے لمحے ہی میں لکھی گئی ہوں اور پھر خطوط کی صورت میں یہ تحریریں زیادہ تر نجی ہوتی ہیں، عام قارئین کا ان میں کوئی تصور بھی نہیں ہوتا ۔ لیکن زمانے کی ستم ظریفی سے یہ نجی تحریریں بھی پبلک میں آ کر رہتی ہیں ۔ یہی وہ نازک مقام ہے جس سے غالب بھی اپنے زمانے میں خائف ہوئے تھے اور ہر وہ مکتوب نگار خائف ہوتا ہے جو طباعت و اشاعت کے خطرے سے بے نیاز ہو کر عام کاروبار زندگی کی سطح پر خط کتابت کرتا رہتا ہے اور جب یہ خطرہ امر واقع بننے لگتا ہے تو کاتب تحریر کا اضطراب قابل دید ہوتا ہے ۔ یہ خطرہ اقبال کو بھی پیش آیا ، اگرچہ ان کے خطوط کے مجموعے ان کی وفات کے بعد چھپنے شروع ہوئے اور اب تو ''تبرکات'' اقبال کے طور پر ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر ہر لفظ محفوظ کیا جا رہا ہے، خواہ وہ کسی دوا کے اشتہار کے طور ہی پر کیوں نہ ہو ۔ اقبال نے اپنی زندگی میں اس خطرے کا احساس کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھا ہے :

''مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ آپ میرے خطوط محفوظ رکھتے ہیں ۔ خواجہ حسن نظامی بھی ایسا ہی کرتے ہیں ۔ کچھ عرصہ ہوا، جب انھوں نے میرے خطوط ایک کتاب میں شائع کر دیئے تو مجھے بہت پریشانی ہوئی کیونکہ خطوط ہمیشہ عجلت میں لکھے جاتے ہیں اور ان کی اشاعت مقصود نہیں ہوتی ۔ عدیم الفرصتی تحریر میں ایک ایسا انداز پیدا کر دیتی ہے جس کو پرائیویٹ خطوط میں معاف کرسکتے ہیں مگر اشاعت ان کی نظر ثانی کے بغیر نہ ہونی چاہیے ۔ اس کے علاوہ میں پرائیویٹ خطوط کے طرز

بیان میں خصوصیت کے ساتھ لاپروا ھوں ۔ امید ھے، آپ میرے خطوط کو اشاعت کے خیال سے محفوظ نہ رکھتے ھوں گے ۔''

(خط محررہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۹ء)

(مکاتیب اقبال، بنام نیازالدین خان، ص ۲۴)

علمی نثر جذبات سے پاک ھوتی ھے ۔ اس میں ٹھوس معلومات اور خشک حقائق منطقی پیرائے میں پیش کر کے کچھ نتیجے نکالے جاتے ھیں ۔ ایسی نثر کو شعر کی ضد بھی کہا جا سکتا ھے ۔ اس میں تاثرات بیان کرنے کی گنجائش ھی نہیں ھوتی ، نہ متاثر کرنا اس کا مقصود اصلی ھے ۔ اس کا مقصد تو قائل کرنا ھوتا ھے ۔ قواعد زبان کی پابندی کے علاوہ موضوع کو مناسب الفاظ اور مختصر پیرائے میں پیش کر دیا جائے تو معلومات کے راست ابلاغ میں سہولت اور قائل کرنے میں آسانی ھوتی ھے ۔ سادگی اور سلاست بھی اس کے لیے اضافی باتیں ھیں کیونکہ کسی علمی موضوع کے بیان میں متعلقہ علم کی کچھ مصطلحات بھی آئیں گی اور کچھ خاص الفاظ بھی، جو بظاھر ادق ھو سکتے ھیں لیکن موضوع کی مناسبت سے ان کا تحریر میں آنا ناگزیر ھوتا ھے۔ اس قسم کی نثر کے مخاطب بھی عام قارئین نہیں ھوتے بلکہ اس علم کے متلاشی ھوتے ھیں اور تحریر میں اگر مؤلف علم کی اس خاص شاخ کی مصطلحات اور الفاظ کے علی الرغم اپنی بات کی وضاحت میں کامیاب ھو جائے تو اس کے اسلوب کو اطمینان بخش کہا جائے گا ۔ اقبال کی تالیف ''علم الاقتصاد'' کا شمار اسی ذیل میں ھوتا ھے ۔

اقتصادیات یا سیاست مدن کا مضمون علم کی ایک نئی شاخ کے طور پر ملک کے نظام تعلیم میں شامل ھو رھا تھا ۔ موجودہ زمانے کے معاشی مسائل نے اس علم میں بے پناہ وسعت پیدا کر دی ھے ۔ آج سے ستر سال قبل جب اقبال نے اپنی اس پہلی تالیف کی تدوین کی تو اس وقت اردو میں اس علم کی اصطلاحات کو وضع کرنے کا مسئلہ بھی درپیش تھا ۔ اقبال نے

بعض اصطلاحات خود وضع کی ھیں اور بعض عربی زبان کی متداول اصطلاحات کو اردو میں لے لیا ھے ۔ اس علم کے نقطۂ نظر سے انھوں نے جہاں کسی اردو لفظ کو نیا مفہوم پہنایا ھے اس کی تصریح بھی ساتھ ھی کر دی ھے ۔ انھوں نے انگریزی محاورے کی تقلید میں اسم ذات کو اسم صفت کے معنوں میں بھی استعمال کیا ھے مثلاً ''سرمایہ'' سرمایہ داروں کے معنی میں یا ''محنت'' محنت کشوں کے معنی میں ۔ سرمایہ و محنت کا یہ مفہوم اُس وقت اردو والوں کے لیے غیر مانوس ھو گا لیکن اقتصادیات کے علم کے ساتھ بالآخر یہ اردو کا عام محاورہ بن چکا ھے اور سرمایہ و محنت کی یہ آویزش آج ادبیات میں بھی خوب چلتی ھے۔ علمی تقاضے کے تحت اقبال نے اصطلاحات، الفاظ اور محاورے کے استعمال میں مذاق سلیم سے کام لیا ھے اور خواہ مخواہ نامانوس عربی الفاظ اردو میں ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی۔ مرادفات کے استعمال میں بھی ان کے باریک فرق کو ملحوظ رکھا ھے ۔ دیباچے میں اس امر کی وضاحت کرتے ھوئے لکھتے ھیں کہ ''میں نے مانگ اور طلب، دستکاری اور محنت، دستکار اور محنتی، نفع اور منافع، ساھوکار اور سرمایہ دار، مالک و کارخانہ دار مرادف استعمال کیے ھیں ۔ پیدایش اور پیداوار کا استعمال ایک باریک فرق کو ظاھر کرتا ھے ۔ یعنی پیدایش سے مراد فعل کی ھے اور پیداوار سے مراد نتیجۂ فعل کی ۔ علیٰ ھذالقیاس لفظ تبادلہ اس جگہ استعمال کیا ھے جہاں مبادلۂ اشیاء زر نقد کی وساطت سے کیا جائے اور لفظ مبادلہ اس موقع پر استعمال کیا ھے جہاں ایک شے دوسری شے کے عوض میں دی جائے ۔ عربی زبان میں مبادلے کا یہ مفہوم لفظ مقائضہ سے ظاھر کیا جاتا ھے مگر چونکہ یہ لفظ عام فہم نہیں ھے ، اس واسطے میں نے اس کے استعمال سے احتراز کیا ھے''۔

(دیباچہ علم الاقتصاد ، ص ۲۵ ، ۲۶)

علمی لحاظ سے زبان کو باثروت بنانے کی اس قابل قدر کوشش کے

باوجود اقبال زباندانی کے بارے میں یہ عذر خواہی کرتے ہیں :

''زبان اور طرز عبارت کے متعلق صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہو گا کہ میں اہل زبان نہیں ہوں - جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا ہے میں نے اقتصادی اصولوں کے حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اردو زبان میں اس متین طرز عبارت کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزی علمی کتابوں میں عام ہے۔''

(دیباچہ علم الاقتصاد، ص ۲۰)

اگر ''اہل زبان'' کو بھی یہاں بطور ایک اصطلاح کے لیا جائے تو اقبال کا اہل زبان نہ ہونا اس تالیف کے لیے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ اگر وہ ''اہل زبان'' ہوتے تو محاورے اور روزمرے کے چٹخارے سے بچنا ان کے لیے مشکل ہوتا اور وہ علمی لحاظ سے متین طرز عبارت اس خوبی سے اختیار نہ کر سکتے - ''علم الاقتصاد'' کے اسلوب کو اس لحاظ سے اردو میں علمی نثر کا پہلا کامیاب تجربہ کہا جا سکتا ہے - اس تالیف کی عبارتیں متانت اور وقار کے ساتھ معلومات کی ترسیل کرتی ہیں - اس میں کوئی فالتو بات، کوئی معنوی ابہام، کوئی لفظی رعایت دور دور تک نظر نہیں آئے گی - موضوع خشک ہے - لکھنے والے کو بھی اپنی ذات کی قربانی دے کر اس میں ریاضت کرنی پڑی ہے - عام دلچسپی یہاں مفقود ہے لیکن اقتصادیات کے متلاشی کے لیے آج سے ستر سال قبل کی معلومات کے مطابق اس میں بہت کچھ ہے - علم الاقتصاد اور علم الاخلاق کے باہمی ربط کے بارے میں مندرجہ ذیل سطور اس طرز تحریر کی متانت ظاہر کرنے کے علاوہ عام قاری کے نقطۂ نظر سے بھی بصیرت افروز ہوں گی :

''اگرچہ علم الاقتصاد دیگر علوم میں سے بعض کے ساتھ ایک ضروری تعلق رکھتا ہے مگر علم الاخلاق کے ساتھ اس کا تعلق بہت گہرا ہے - اس علم کی طرح علم الاخلاق کا موضوع بھی وہی اشیاء ہیں جو بعض انسانی مقاصد کے حصول سے وابستہ ہیں - فرق صرف

اس قدر ہے کہ علم اخلاق کا موضوع وہ افعال ہیں جو زندگی کے افضل ترین مقصد کے حصول کی شرائط ہیں اور علم الاقتصاد کا موضوع وہ اشیاء ہیں جو انسان کے معمولی مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہیں - اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کے معمولی مقاصد کی پوری قدر سمجھنے کے لیے ان پر اخلاقی مقاصد کے لحاظ سے نگاہ ڈالنا چاہیے - مثلاً خوراک، لباس، مکان ، ہماری زندگی کے لیے ضروری ہیں اور ان کی قدر ان مقاصد کی قدر پر منحصر ہے جن کو یہ پورا کرتے ہیں۔ مگر زندگی کے ان معمولی مقاصد کی اصلی وقعت صرف اس صورت میں معلوم ہو سکتی ہے جب ہم ان پر زندگی کے افضل ترین مقصد کے لحاظ سے غور کریں - اس لیے علم الاقتصاد کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لیے کسی قدر مطالعہ علم اخلاق کا بھی ضروری ہے - اکثر مصنفین نے اس صداقت کو محسوس نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت بلا لحاظ زندگی کے افضل ترین مقصد کے بجائے خود ایک مقصد تصور کی گئی جس سے بعض تمدنی اصلاحوں کے ظہور پذیر ہونے میں بے جا تعویق ہوئی اور دولت کے پیار کرنے والوں کی حرص و آز پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی''۔

(علم الاقتصاد، طبع ۱۹۶۱ء، ص : ۲۰، ۲۱)

کچھ مضامین ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا موضوع تو علمی ہوتا ہے لیکن یہ علمی موضوع جذبے کی تحریک سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ جذبہ اجتماعی زندگی کے کسی نہ کسی احساس سے پیدا ہوتا ہے - اس لیے اس میں جذبے اور فکر کی آمیزش بڑے معتدل انداز میں ہوتی ہے - اس قسم کی تحریک میں تاثرات کی لہریں اور جذبے کی حدت تو ایک حد تک موجود ہوتی ہے لیکن تخیل کی جولانی مفقود ہوتی ہے - الفاظ کی موزونیت، لہجے کی متانت اور ایجاز بیان اس تحریر کا خاصہ ہوتا ہے - اقبال کی اکثر

تحریریں جن میں ''مخزن'' کے ابتدائی دور کے مضامین سے لے کر وہ مکاتیب بھی شامل کیے جا سکتے ہیں جو انہوں نے کسی نہ کسی قومی مسئلے کے بارے میں یا اپنے افکار و اشعار کی وضاحت کے سلسلے میں لکھے ہیں ۔ مخزن کے ابتدائی دور میں لکھے گئے مضامین میں اقبال نے رومانی تحریک کے بعض خصائص اپنے اسلوب میں جذب کیے ہیں لیکن اعتدال کے ساتھ ۔ ان کی نثر میں تخیل کے بے محابا ہونے کی توگنجائش ہی نہ تھی ، وہ تخیل سے کام لیتے ہیں لیکن تخیل پر تعقل کو حکمران بناتے ہیں ۔ جذبہ بھی کار فرما ہے لیکن جذبے پر فکر غالب ہوتا ہے ۔ الفاظ کی در و بست میں لطافت ملحوظ ہے لیکن عبارت حشو و زوائد سے پاک ہے۔ آرائش بیان کی بجائے ان کی نظر حقائق کے اظہار پر رہتی ہے ۔ محاوروں کا استعمال بھی ان کی تحریر میں کم سے کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی ان تحریروں کو پڑھ کر قاری کا ذہن ایک لحظہ کے لیے بھی اسلوب کی بھول بھلیوں میں نہیں الجھتا اور نہ ہی مطالب سے کہیں جدا ہوتا ہے۔ اسلوب بیان اور مدعا نگاری کا یہ حسین امتزاج جس میں ابلاغ کے تقاضوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اقبال کی نثر کا خاص وصف ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں اپنی معتدل لطافت اور دلکشی سے پڑھنے والوں کو محظوظ بھی کرتی ہیں اور اپنے علمی مطالب سے ذہنوں کو قائل اور دلوں کو متاثر بھی کرتی ہیں۔

''بچوں کی تعلیم و تربیت'' اور ''قومی زندگی،، مخزن کے ابتدائی دور میں چھپنے والے مضامین میں سے ہیں ۔ ان کے مطالعے سے مذکورہ بالا نثری محاسن کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ اتفاق سے یہ موضوعات بھی کم و بیش وہی ہیں جن پر سرسید کے زمانے سے مضامین کا سلسلہ جاری تھا ۔ ''بچوں کی تعلیم و تربیت'' ٹیکنیکی موضوع ہے جس میں بچے کی نفسیات کو مد نظر رکھ کر اس کی تعلیم و تربیت کے مختلف امور

سے بحث کی گئی ہے ۔ اس خالص علمی اور ٹیکنیکی بحث میں مصطلحات تعلیمی کے علی الرغم اقبال نے سادا، سلیس اور دلنشین انداز میں فلسفۂ تعلیم کی باریکیوں کو خوش اسلوبی سے سلجھایا ہے اور وضاحت کے لیے گرد و پیش کی زندگی کے مشاہدات سے ایسی چھوٹی چھوٹی جزئیات پیش کی ہیں جو بعض مقامات پر تصویر نما بن کر ایک مصور ادیب کے موقلم کا کرشمہ بن گئی ہیں ۔ فلسفی، ماہر تعلیم اور ادیب کا یہ خوشگوار ملاپ موضوع کی وضاحت کے لیے ضروری تھا ، کیونکہ یہ مضمون افادۂ عام کی خاطر لکھا گیا تھا اور اس کی غایت اقبال کے الفاظ میں یہ تھی :

''اس مضمون کی تحریر سے ہماری یہ غرض ہے کہ علمی اصولوں کی رو سے بچپن کا مطالعہ کر کے یہ معلوم کریں کہ بچوں میں کون کون سے قواء کا ظہور پہلے ہوتا ہے اور ان کی تعلیم و تربیت کس طرح ہونی چاہیئے ۔ ہم ایک ایسا طریق پیش کرنا چاہتے ہیں جو محض خیالی ہی نہیں ہے بلکہ ایک قابل عمل طریق ہے جس سے بچوں کی تعلیم کے لیے ایسے آسان اور صریح اصول ہاتھ آ جاتے ہیں جن کو معمولی سمجھ کا آدمی سمجھ سکتا ہے اور ان کے نتائج سے مستفید ہو سکتا ہے ۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ناظرین ان سے فائدہ اٹھائیں گے اور اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم میں ان اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھیں گے''۔

(مقالات اقبال، ص ۳)

اب اس مضمون کے مطالب اور اسلوب کی چند صورتیں ملاحظہ ہوں جن سے مذکورہ بالا تصریحات کی تصدیق بخوبی ہو جائے گی :

(۳) بچوں کو اشیاء کے غور سے دیکھنے اور بالخصوص ان کے چھونے میں لطف آتا ہے ۔ تین مہینے کی عمر کا بچہ ہو اور اس کی توجہ روشنی کی طرف منتقل ہو جائے تو ہاتھ پھیلاتا ہے اور شمع کے شعلے کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے ۔ نظر کے فعل سے

اس کی تسلی نہیں ہوتی ۔ حس لامسہ سے بھی مدد طلب کرتا ہے۔ کیونکہ اسے قدرتاً اشیاء خارجی کے چھونے میں مزا آتا ہے ۔ یہ بات تو ہر شخص کے تجربہ میں آئی ہوگی کہ جب بچے کی نظر دیوار کی کسی تصویر پر جا پڑے تو بے اختیار چلانے لگتا ہے اور چاہتا ہے کہ تصویر اتار کر اس کے ہاتھوں میں دے دی جائے ۔ چلانے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے میاں اب چپ ہونے میں نہیں آئیں گے ۔ مگر جب مطلوبہ شے سامنے رکھ دی جائے تو چپ ہو جانا تو ایک طرف بعض اوقات آپ کی ہنسی بھی نکل جاتی ہے ۔ پس جس شے کے متعلق سبق دو اس کو بچے کے سامنے رکھو اور جب سبق ختم ہو جائے تو شے مذکور اس کے ہاتھ میں دے دو۔ مشاہدہ سے حس بصر کی تربیت ہوتی ہے، چھونے سے قوت لمس معتدبہ فروغ پاتی ہے، گفتگو اور راگ وغیرہ سے قوت سامعہ ترقی کرتی ہے۔ اس طرح لمس اور بصر کے متحدہ استعمال سے بچے کو صورت شے کا ادراک ہوتا جائے گا۔

(مقالات اقبال، ص ٥)

(٥) بچے میں بڑوں کی نقل کرنے کا مادہ خصوصیت سے زیادہ ہوتا ہے ۔ ماں ہنستی ہے تو خود بھی بے اختیار ہنس پڑتا ہے ۔ باپ کوئی لفظ بولے تو اس کی آواز کی نقل اتارے بغیر نہیں رہتا ۔ ذرا بڑا ہوتا ہے اور کچھ باتیں بھی سیکھ جاتا ہے تو اپنے ہمجولیوں کو کہتا ہے، آؤ بھئی ہم مولوی بنتے ہیں تم شاگرد بنو ۔ کبھی بازار کے دوکان داروں کی طرح سودا سلف بیچتا ہے ۔ کبھی پھر کر اونچی آواز دیتا ہے کہ ''چلے آؤ انار سستے لگا دیئے''۔ اس وقت میں بڑا ضروری ہے کہ استاد اپنی مثال بچے کے سامنے پیش کرے تاکہ اسے اس کے ہر فعل کی نقل کرنے کی تحریک ہو۔

(مقالات اقبال، ص ٦)

(٦) قوت متخیلہ یا واہمہ بھی بچوں میں بڑی نمایاں ہوتی ہے ۔ شام ہوئی اور لگا ستانے اپنی ماں کو ''اماں جان! کوئی کہانی تو کہہ دو'' ۔ ماں چڑیا یا کوے کی کہانی سناتی ہے تو خوشی کے مارے لوٹ جاتا ہے۔ ذرا بڑا ہوا اور پڑھنا سیکھ گیا تو ناولوں اور افسانوں کا شوق پیدا ہوتا ہے ۔ استاد کو چاہیے کہ قوت واہمہ کی نمو کی طرف بالخصوص خیال رکھے ۔ ایسا نہ ہو کہ یہ قوت بے قاعدہ طور پر بڑھ جائے اور اس سے قوائے عقلیہ کی ترقی میں نقص پیدا ہو ۔ بعض حکماء کی رائے ہے کہ اس قوت کی تربیت کی اتنی ضرورت نہیں جس قدر کہ اسے مناسب حدود کے اندر رکھنے کی ہے ۔ بچے کی اس خصوصیت سے بے انتہا تعلیمی فائدہ ہو سکتا ہے ۔ اکثر مکتبوں میں لڑکے کاغذ کی کشتیاں دن رات بنایا کرتے ہیں ، قوت واہمہ کے لیے یہ اچھی مشق ہے ۔

(مقالات اقبال، ص ٦)

ان اقتباسات میں حس لامسہ، حس بصر ، قوت لمس، قوت سامعہ، قوت متخیلہ، قوت واہمہ، قوائے عقلیہ، صورت شے، ادراک وغیرہ اس موضوع کے ٹیکنیکی الفاظ و مصطلحات ہیں جو سادا و رواں عبارت کے اندر بڑی خوبی کے ساتھ آئے ہیں ۔ موضوع علمی ہے لیکن اس میں جا بجا گفتگو اور مکالمے کا پیرایہ اختیار کر کے بے تکلفی کا رنگ دیا گیا ہے جو انشائیہ نگاری کا خاصہ ہے ۔ اس سے وہ خشکی اور ثقالت جو علم الاقتصاد کے اسلوب میں نظر آتی ہے، یہاں ناپید ہے ۔

''قومی زندگی،، میں جذبات کا لاوا ابل رہا ہے، تاثرات کا ہجوم شدت جذبات کا آئینہ دار ہے لیکن مصنف کا قلم یہاں بھی بے قابو نہیں ہو پایا اور نہ ہی تخیل کی لامحدود پہنائیوں میں گم ہوا ہے ۔ وہ تلخ حقائق کو درد مندانہ پیرائے میں بڑی سادگی ، سلاست اور روانی کے ساتھ بیان کرتا چلا جاتا ہے اور ان سے جو نتائج اخذ کرتا ہے وہ پڑھنے

والے کو متاثر و مطمئن کرتے ھیں - جذبے اور عقل کا یہ خوشگوار امتزاج اس مضمون کا خاصہ ھے اور اس کی اھمیت کا احساس آغاز ھی میں ان سطور سے ھو جاتا ھے جہاں مصنف اقوام عالم کی تاریخ کے اس نازک دور میں قلم اور تلوار کا موازنہ کرتے ھوئے یہ کہتا ھے :

''ایک زمانہ تھا جب کہ اقوام دنیا کی باھمی معرکہ آرائیوں کا فیصلہ تلوار سے ھوا کرتا تھا اور یہ فولادی حربہ دنیاے قدیم کی تاریخ میں ایک زبردست قوت تھی - مگر حال کا زمانہ ایک عجیب زمانہ ھے جس میں قوموں کی بقا ان کے افراد کی تعداد، ان کے زور بازو اور ان کے فولادی ھتھیاروں پر انحصار نہیں رکھتی بلکہ ان کی زندگی کا دار و مدار اس کاٹھ کی تلوار پر ھے جو قلم کے نام سے موسوم کی جاتی ھے''۔

(مقالات اقبال، ص ۳۹)

جذبے اور فکر کی آمیزش نے اس مضمون کے اسلوب میں سلاست اور روانی پیدا کر دی ھے - چھوٹے چھوٹے فقرے سانس کے زیر و بم کے ساتھ نہایت بے ساختگی سے ھجوم در ھجوم چلے آتے ھیں جیسے کوئی ندی دامن کہسار سے نکلتی ھوئی موج در موج سکون خاطر کی تلاش میں میدان کی جانب رواں دواں ھو - اس فکر انگیز نثر کے چند نمونے ملاحظہ ھوں :

''واقعات عالم کے مشاھدہ سے حکماء اس نتیجے پر پہنچے ھیں کہ زندگی کی مختلف صورتوں یعنی انسانوں، حیوانوں، پودوں وغیرہ میں ایک قسم کی عالمگیر جنگ جاری رھتی ھے - گویا نظام فطرت کا راز کارزار زندگی کا ایک دردناک نظارہ ھے، جس میں ھر طبقے کے حیوان اپنے ھمسایہ طبقوں سے بر سر پیکار رھتے ھیں اور اس کشمکش حیات میں کامیاب ھونے کے لیے ھر طبقۂ زندگی مصروف رھتا ھے - لیکن فتح صرف اسی طبقے کو حاصل ھوتی ھے جس میں رھنے کی قابلیت ھو، یعنی جس نے زندگی کے متغیر حالات کے ساتھ

موافقت پیدا کر لی ھو''۔

(مقالات اقبال، ص ۴۱)

''مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ھے کہ اس اعتبار سے مسلمانوں کو دیکھا جائے تو ان کی حالت نہایت مخدوش نظر آتی ھے - یہ بدقسمت قوم حکومت کھو بیٹھی ھے - صنعت کھو بیٹھی ھے - تجارت کھو بیٹھی ھے - اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تیز تلوار سے مجروح ھو کر ایک بے معنی توکل کا عصاء ٹیکے کھڑی ھے - اور باتیں تو خیر، ابھی تک ان کی مذھبی نزاعوں کا ھی فیصلہ نہیں ھوا - آئے دن ایک نیا فرقہ پیدا ھوتا ھے جو اپنے آپ کو جنت کا وارث سمجھ کر باقی تمام نوع انسان کو جہنم کا ایندھن قرار دیتا ھے - غرضیکہ ان فرقہ آرائیوں نے خیرالامم ؐ کی جمعیت کو کچھ ایسی بری طرح منتشر کر دیا ھے کہ اتحاد و یگانگت کی کوئی صورت نظر نہیں آئی''۔

(مقالات اقبال، ص ۵۲)

''عوام کی تو کچھ نہ پوچھیے، کوئی اپنی عمر کا اندوختہ بچے کے ختنے پر اڑا رھا ھے- کوئی استاد کے خوف سے اپنے ناز پروردہ لڑکے کا پڑھنا لکھنا چھڑا رھا ھے - کوئی دن بھر کی کمائی شام کو اڑاتا ھے اور کل کا اللہ مالک ھے کہہ کر اپنے دل کو تسکین دیتا ھے - کہیں ایک معمولی بات پر مقدمہ بازیاں ھو رھی ھیں- کہیں جائیداد کے جھگڑوں سے جائیدادیں فنا ھو رھی ھیں - غرض کس کس کی شکایت کریں - لنکا میں جو رھتا ھے باون ھی گز کا ھے - تمدن کی یہ صورت کہ لڑکیاں ناتعلیم یافتہ، نوجوان جاھل، روزگار ان کو نہیں ملتا - صنعت سے یہ گھبراتے ھیں - حرفت کو یہ عار سمجھتے ھیں - مقدمات نکاح کی تعداد ان میں روز بروز بڑھ رھی ھے - جرم کی مقدار روز افزوں ھے - دماغ

شاهجهانی، آمدنیاں قلیل اور افلاس کا یه عالم که رمضان خوب مهینه هے مسلمانوں کا''۔

(مقالات اقبال، ص ۵۳)

تاثرات کے اس هجوم میں بھی بے ساخته طور پر بعض برجسته فقرے تصویر نما پیرائے میں نظروں کے سامنے آ جاتے هیں که جنهیں ادبی لحاظ سے خیال افروز کها جا سکتا هے، مثلاً:

''برق جس کی مضطربانه چمک تهذیب کے ابتدائی مراحل میں انسان کے دل میں مذهبی تاثرات کا ایک هجوم پیدا کر دیا کرتی تھی، اب اس کی پیام رسانی کا کام دیتی هے۔ سٹیم اس کی سواری هے اور هوا اس کے پنکھے جھلا کرتی هے''۔

(مقالات اقبال، ص ۴۰)

''میں صنعت و حرفت کو قوم کی سب سے بڑی ضرورت خیال کرتا هوں اور اگر میرے دل کی پوچھو تو سچ کهتا هوں که میری نگاه میں اس بڑهئی کے هاتھ جو تیشے کے متواتر استعمال سے کھردرے هو گئے هیں، ان نرم نرم هاتھوں کی نسبت بدرجها خوبصورت اور مفید هیں جنهوں نے قلم کے سوا کسی اور چیز کا بوجھ کبھی محسوس نهیں کیا''۔

(مقالات اقبال، ص ۶۱)

اقبال کے ابتدائی دور کے مضامین میں جذبات، افکار اور تاثرات کا کسی قدر هجوم بھی هے جو کچھ تو مخزن کی رومانی ادبی تحریک کے اثر سے هے اور کچھ طبیعت کا وہ رنگ بھی اس میں جھلکتا هے جو ایام شباب کی یاد دلاتا هے۔ بانگ درا کے ابتدائی دور کی شاعری کو بھی اس کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو یه بات پوری طرح واضح هو جائے گی۔ اس زمانے کے ملکی و قومی حالات کے اثر سے جذباتی هیجان کا پیدا هونا قدرتی امر تھا جو شاعری میں قدرے گهرا اور شوخ هو گیا هے

لیکن نثر میں اپنی عقلی تربیت کی وجه سے اقبال نے جذبے اور فکر کی آمیزش سے میانه روی اختیار کی هے۔ یورپ سے واپسی کے بعد اس جذباتی هیجان میں بهت کمی آ چکی تھی۔ البته جذبے کی گرمی، فکر کی رفعتوں سے مل کر حقائق کی ایک نئی وادی میں گامزن سفر هوئی۔ اسرار و رموز، اسی وادی کے ثمر هیں۔

نثر میں بھی ان ثمرات کی جھلک نظر آ جاتی هے، لیکن یه نگارشات مضامین کی صورت میں کم اور خطوط کی شکل میں زیاده هیں۔ ان خطوط میں اقبال نے یا تو اپنے افکار کی وضاحت کی هے یا کسی نه کسی علمی مسئلے پر استفسار کا جواب دیا هے یا اظهار خیال کیا هے۔ ظاهر هے که یه اظهار ان خطوط کے مکتوب الیهم کی شخصیت، علمی مرتبے اور تعلقات کی نوعیت کے مطابق هوا هے۔ عام قارئین یهاں مدنظر نهیں تھے (ان مکتوب الیهم میں سید سلیمان ندوی جیسی شخصیات شامل هیں) اقبال کے اسلوب میں یهاں خاصا ٹھهراؤ هے۔ وہ بڑے ٹھوس انداز میں فلسفیانه مسائل پر بے ساخته طور پر لکھتے چلے جاتے هیں۔ خودی اور زمان و مکان کے تصورات پر علمی مصطلحات اور عربی و فارسی کے دقیق الفاظ بھی ان تحریروں میں آتے هیں (اور یه ناگزیر تھے) لیکن وضاحت هر جگه مد نظر هے۔ کم سے کم الفاظ میں زیاده سے زیاده مطالب بیان کرنا اقبال کے اسلوب کا عام وصف هے لیکن خطوط میں تو یه اور بھی ضروری هو جاتا هے۔ کیونکه یهاں طول بیانی کی کوئی گنجائش هی نهیں هوتی۔ اور پھر چونکه کاتب کو مکتوب الیه کی فضیلت علمی پر بھروسه هوتا هے اس لیے وہ ایجاز بیان کی روش اور بھی زیاده بے تکلفی سے اختیار کر سکتا هے۔ تاهم ان تحریروں میں عام قاری بھی اقبال کے نقطه نظر کو بخوبی سمجھ سکتا هے اور بلا مبالغه یه کها جا سکتا هے که شارحین اقبال کی فلسفیانه موشگافیوں کی به نسبت یه تحریریں افکار اقبال کی وضاحت کے سلسلے میں زیاده قابل فهم هیں اور ان کی روشنی میں

فکر اقبال کی بعض باریکیوں کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے ۔ خطوط میں سے چند مقامات بطور مثال یہاں پیش کیے جاتے ہیں ۔ ذیل کے دو اقتباس استفسار کی صورت میں ہیں جن کے مخاطب سید سلیمان ندوی ہیں :

''اگر دہر ممتد اور مستمر ہے اور حقیقت میں اللہ تعالٰی ہی ہے تو پھر مکان کیا چیز ہے؟ جس طرح زمان دہر کا ایک طرح سے عکس ہے اسی طرح مکان بھی دہر ہی کا عکس ہونا چاہیے گویا یوں کہیے کہ زمان و مکان دونوں کی حقیقت اصلیہ دہر ہی ہے، کیا یہ خیال محی الدین ابن عربی کے نقطہ خیال سے صحیح ہے؟''

(اقبالنامہ، حصہ اول، ص ۱۸۰)

''دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے ۔ جمہوریت فنا ہو رہی ہے اور اس کی جگہ ڈکٹیٹر شپ قائم ہو رہی ہے ۔ جرمنی میں مادی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جا رہی ہے ۔ سرمایہ داری کے خلاف پھر ایک جہاد عظیم ہو رہا ہے ۔ تہذیب و تمدن (بالخصوص یورپ میں) بھی حالت نزع میں ہے ۔ غرض کہ نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے ۔ ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک ممد ہو سکتا ہے ۔ اس مبحث پر اپنے خیالات سے مستفیض فرمائیے''۔

(اقبالنامہ، ص ۱۸۱)

ذیل کے اقتباسات ظفر احمد صدیقی کے نام ایک خط میں سے ہیں جس میں ''کسی ترقی پسند'' معترض کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے اقبال نے اپنے افکار کی وضاحت کی ہے :

''آخر اس غلامی کے زمانہ میں مسلمانوں کے پاس کونسا ذریعہ ہے جس سے وہ اپنی آئندہ نسلوں کو اسلامی تصورات کے بننے اور بگڑنے کی تاریخ سے آگاہ کر سکیں ۔ غلام قوم مادیات کو روحانیات پر مقدم سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور جب انسان میں خوئے

غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد قوت نفس اور روح انسانی کا ترفع ہو''۔

''حدود خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے ۔ جب احکام الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے فنا کہا ہے، بعض نے اسی کا نام بقا رکھا ہے ۔ لیکن ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے مسئلۂ فنا کی تفسیر فلسفۂ ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے ۔ میرے عقیدہ کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں''۔

''شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ۔ اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں (۱) خود دار اور غیرتمند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا (۳) بلند پرواز ہے (۴) خلوت پسند ہے (۵) تیز نگاہ ہے''۔

(اقبالنامہ، حصہ اول، ص ۲۰۱ تا ۲۰۵)

مضامین میں بھی دقیق علمی مسائل کی وضاحت کا یہی عالم ہے لیکن یہاں چونکہ فضا قدرے کشادہ ہے اور مخاطب کوئی ایک شخص نہیں بلکہ صاحب علم قارئین کی جماعت ہے، اس لیے بیان میں بھی کسی قدر صراحت آ گئی ہے۔ ''اسرار خودی'' کا دیباچہ جو پہلے ایڈیشن کے

ساتھ شائع ہوا، اقبال کی فلسفیانہ تحریروں میں قابل ذکر ہے ۔ چند سطور ملاحظہ ہوں :

''یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں ، یہ پر اسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے یہ ''خودی،، یا ''انا'' یا ''میں'' جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے ؟ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرز عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہو گی جس کے حکماء و علماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لیے دماغ سوزی نہ کی ہو۔ مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا جس قدر کہ ان کی افتاد طبیعت پر ۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی انا محض ایک فریب تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام نجات ہے ۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا جس کے لیے ان کی فطرت متقاضی تھی''۔

(مقالات اقبال، ص ۱۵۳ - ۱۵۴)

''رموز بے خودی'' کا دیباچہ اسرار خودی کے دیباچے سے بھی مختصر، بمشکل دو صفحات پر مشتمل ہے لیکن ان چند سطور میں اقبال نے

اپنے اس فلسفے کی روح سمو دی ہے ۔ حکیمانہ نثر کا یہ ٹکڑا بھی اپنے مطالب کی وضاحت میں پوری طرح کامیاب ہے :

''جس طرح حیات افراد میں جلب منفعت، دفع مضرت، تعین عمل و ذوق حقائق عالیہ احساس نفس کے تدریجی نشو و نما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے اسی طرح ملل و اقوام کی حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظ دیگر ''قومی انا'' کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیات ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افراد اقوام کسی آئین مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تا کہ انفرادی اعمال کا تبائن و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لیے ایک قلب مشترک پیدا ہو جائے ۔ افراد کی صورت میں احساس نفس کا تسلسل قوت حافظہ سے ہے ۔ اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے ۔ گویا قومی تاریخ حیات ملیہ کے لیے بمنزلہ قوت حافظہ کے ہے جو اس کے مختلف مراحل کے حسیات و اعمال کو مربوط کر کے ''قومی انا'' کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم رکھتی ہے ۔ علم الحیات و عمرانیات کے اسی نکتے کو مدنظر رکھ کر میں نے ملت اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی اور اس کے مختلف اجزاء و عناصر پر نظر ڈالی ہے، اور مجھے یقین ہے کہ امت مسلمہ کی حیات کا صحیح ادراک اسی نقطہ نگاہ سے حاصل ہو سکتا ہے''۔

(مقالات اقبال، ص ۱۹۱، ۱۹۲)

''اسرار خودی'' کی طباعت کے بعد بحث کا جو سلسلہ شروع ہوا، اس میں اقبال نے بھی حصہ لیا اورتصوف کے بارے میں اپنے موقف کی وضاحت کی ۔ اگرچہ اس بحث نے خاصی ناخوشگوار صورت اختیار کر لی تھی لیکن اقبال مناظرے اور معارضے کی اس فضا میں بھی جذبات سے کہیں مغلوب نہیں ہوئے اور اپنے موقف کی حمایت میں استدلال کا دامن تھامے رکھا اور اس

طرح بحث کو تلخیوں کی آلودگی سے بچا کر نکل گئے - اس سلسلے میں انہوں نے فن شعر کی تنقید کا فریضہ بھی انجام دیا اور اپنے تنقیدی خیالات کو تجزیاتی انداز میں پیش کیا - عملی تنقید کا یہ نمونہ قابل دید ہے :

''شاعرانہ اعتبار سے میں حافظ کو نہایت بلند پایہ سمجھتا ہوں - جہاں تک فن کا تعلق ہے یعنی جو مقصد اور شعرا پوری غزل میں بھی حاصل نہیں کر سکتے خواجہ حافظ اسے ایک لفظ میں حاصل کرتے ہیں - اس واسطے کہ وہ انسانی قلب کے راز کو پورے طور پر سمجھتے ہیں - لیکن فردی اور ملی اعتبار سے کسی شاعر کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے کوئی معیار ہونا چاہیئے- میرے نزدیک وہ معیار یہ ہے کہ اگر کسی شاعر کے اشعار اغراض زندگی میں ممد ہیں تو وہ شاعر اچھا ہے اور اگر اس کے اشعار زندگی کے منافی ہیں یا زندگی کی قوت کو کمزور اور پست کرنے کا میلان رکھتے ہیں تو وہ شاعر خصوصاً قومی اعتبار سے مضرت رساں ہے - ہر شاعر کم و بیش گرد و پیش کی اشیاء' عقائد' خیالات و مقاصد کو حسین و جمیل بنا کر دکھانے کی قابلیت رکھتا ہے اور شاعری نام ہی اس کا ہے کہ اشیاء و مقاصد کو اصلیت سے حسین تر بنا کر دکھایا جائے تاکہ اوروں کو ان اشیاء و مقاصد کی طرف توجہ ہو اور قلوب ان کی طرف کھنچ آئیں - ان معنوں میں ہر شاہر جادوگر ہے - فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کا جادو کم چلتا ہے کسی کا زیادہ - خواجہ حافظ اس اعتبار سے سب سے بڑے ساحر ہیں'' -

(مقالات اقبال، ص ١٦٦ - ١٦٧)

فن شعر کی تنقید کا یہ حکیمانہ انداز بھی قابل توجہ ہے :

''ہر وہ استعداد جو مبدء فیاض نے فطرت انسانی میں ودیعت کی ہے اور ہر وہ توانائی جو انسان کے دل و دماغ کو بخشی گئی ہے

ایک مقصد وحید اور ایک غایت الغایات کے لیے وقف ہے- یعنی قومی زندگی جو آفتاب بن کر چمکے، قوت سے لبریز، جوش سے سرشار ہو، ہر انسانی صنعت اس غایت آخریں کی تابع اور مطیع ہونی چاہیے اور ہر شے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہیے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے - تمام وہ باتیں جن کی وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اونگھنے لگیں اور جو جیتی جاگتی حقیقتیں ہمارے گرد و پیش موجود ہیں (کہ انہیں پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے) ان کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں، انحطاط اور موت کا پیغام ہے - صنعت گر کو چنیا بیگم کے حلقۂ عشاق میں داخل نہ ہونا چاہیے- مصور فطرت کو اپنی رنگ آرائیوں کا اعجاز دکھانے کے لیے افیون کی چٹکی سے احتراز واجب ہے - یہ پیش پا افتادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ کمال صنعت اپنی غایت آپ ہے، انفرادی، اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ حیلہ ہے جو اس لیے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکا دے کر چھین لی جائے'' -

(مقالات اقبال، ص ١٩٠)

اقتباسات ذرا طویل ہو گئے لیکن اقبال کی حکیمانہ نثر کے اسلوب نگارش کا مطالعہ کرنے کے لیے یہ ضروری تھے - ان نثری تحریروں میں آرائش بیان کی کہیں کوئی صورت نظر نہیں آتی - استعارہ، تشبیہ، تمثیل، محاورے، صنائع بدائع کا دور دور تک کوئی نشان نہیں- بایں ہمہ فکری توانائی، زندگی کی حرارت، جذبے اور لگن کی پر خلوص کیفیت کا بے ساختہ اظہار لفظوں کی در و بست، فقروں کی نوک پلک اور عبارتوں کی سلاست و روانی کے ساتھ مل کر اتنا دلکش ہو گیا ہے کہ ان کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک قلبی راحت کے احساس کے ساتھ حقائق حکمیہ ذہن

نشین ہوتے چلے جاتے ہیں - علمی نثر کا یہ فلسفیانہ و حکیمانہ انداز اقبال کا خاص کارنامہ ہے - لیکن ان کی نثر صرف اسی دائرے میں محدود نہیں - اس کے کچھ اور پہلو بھی ہیں - ادبی نثر کی طرف اقبال نے بطور خاص کوئی توجہ نہیں کی- نثر تو کجا وہ تو اپنی شاعری میں بھی فن کی بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود فن شعر کے کبھی مدعی نہیں ہوئے- لیکن جس طرح ان کی شاعری فکری عظمت کے علاوہ اپنے فنی محاسن کی بدولت قابل قدر ہے، اسی طرح ان کی نثر بھی علمی ہونے کے باوصف اسلوب نگارش کے اعتبار سے قابل ذکر ہے اور اردو نثر کی تاریخ میں اپنا ایک بلند مقام رکھتی ہے - اقبال اگر نثری ادب کی طرف توجہ کرتے تو یقیناً اس میدان میں بھی ان کے ادبی کارنامے اپنے ان مٹ نقوش چھوڑ جاتے، لیکن ادبی تخلیق کے اس دائرے میں وہ ایک آدھ جھلک دکھا کر صاف نکل گئے ہیں- یہ ادبی جھلکیاں بھی زیادہ تر خطوط ہی کی شکل میں ہیں - خاص طور پر وہ خطوط اس سلسلے میں بہت اہم ہیں جن میں انہوں نے اپنے سفر انگلستان کے تاثرات بیان کیے ہیں یا پھر وہ خطوط قابل ذکر ہیں جو بعض بے تکلف احباب کو لکھے گئے ہیں اور جن میں مسائل و معاملات کی بجائے جذباتی کیفیات اور احساسات کی بے ساختہ تصویریں پیش کی گئی ہیں -

اقبال کے کم از کم تین خطوط ایسے ہیں جن میں انہوں نے اپنے اسفار انگلستان کے تاثرات قلم بند کیے ہیں - چونکہ یہ خطوط اشاعت کے لیے لکھے گئے تھے اس لحاظ سے انہیں مضامین یا انشائیے کہنا مناسب ہو گا- یہ مضامین ایک لحاظ سے سفرنامہ بھی ہیں اور رپورتاژ بھی- سفرنامے میں نئے مقامات کی ذرا مفصل روداد ہوتی ہے - اقبال کے ان مضامین میں یہ تفصیل نہیں ہے - صرف اثنائے سفر کے کچھ مشاہدات ہیں، کچھ واقعات ہیں جو جذبات و احساسات کے ساتھ مل کر ایک دلچسپ روداد بن گئے ہیں - اس لیے انہیں رپورتاژ کہنا زیادہ موزوں ہو گا- اقبال کے ان مضامین میں سطح بحر کے یہ مناظر قابل دید ہیں :

”سمندر کا پانی بالکل سیاہ معلوم ہوتا ہے اور موجیں جو زور سے اٹھتی ہیں ان کی سفید جھاگ چاندی کی ایک کلغی سی پہنا دیتی ہے اور دور دور تک ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی نے سطح سمندر پر روئی کے گالے بکھیر ڈالے ہیں“۔

(مقالات اقبال، ص ۷۱)

سمندر میں طلوع آفتاب کا یہ منظر بھی جاذب توجہ ہے :

”میں بہت سویرے اٹھا ہوں- جہاز کے جاروب کش ابھی تختے صاف کر رہے ہیں - چراغوں کی روشنی دھیمی پڑ گئی ہے - آفتاب چشمۂ آب میں سے اٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور سمندر اس وقت ایسا ہی ہے جیسا ہمارا دریائے راوی، شاید صبح کے پرتاثیر نظارے نے اس کو سمجھا دیا ہے کہ سکون قلب بھی ایک نایاب شئے ہے - ہر وقت کی الجھن اور بیتابی اچھی نہیں - طلوع آفتاب کا نظارہ ایک درد مند دل کے لیے تلاوت کا حکم رکھتا ہے“-

(مقالات اقبال، ص ۷۳)

مذکورہ بالا اقتباسات ۱۹۰۵ء کے سفر کے ہیں، ذیل کا اقتباس ۱۹۳۱ء کے سفری مکتوب کا ہے - اس میں تشبیہ اور تمثیل کی ندرت داد طلب ہے - ضرب کلیمی اور گرم مزاجی کی تلمیحات نے اس مختصر بیان میں کتنی فکر انگیز وسعت پیدا کر دی ہے :

”بمبئی سے لے کر اس وقت تک جہاز ملوجا بحر روم کی موجوں کو چیرتا ہوا چل رہا ہے - سمندر بالکل خاموش ہے - طوفان کا نام و نشان تک نہیں ہے - موسم بھی نہایت خوشگوار رہا - البتہ بحر احمر میں گرمی تھی - یہ سمندر عصائے کلیم کا ضرب خوردہ ہے - گرم مزاج کیوں نہ ہو- چاروں طرف جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے سمندر ہی سمندر ہے- گویا قدرت الٰہی نے آسمان کے نیلگوں خیمے کو الٹ کر زمین پر بچھا دیا ہے-“

(گفتار اقبال، ص ۱۴۱)

پہلے سفر (۱۹۰۵ء) میں عدن کے قریب پہنچ کر ساحل عرب کے تصور نے اقبال کے دل میں وفور شوق کی جو کیفیت پیدا کی اس کا اظہار انہوں نے عجیب والہانہ انداز میں کیا ہے۔ جذب و جنوں کا یہ وہ مقام ہے جہاں عقل کے پر جلتے ہیں۔ یہاں اقبال سراپا وادی عشق کے رہرو ہیں اور اسی کیف و مستی کے عالم میں دیار محبوبؐ پر نگاہ ڈالتے ہیں (یہی کیفیت اقبال کی مشہور نظم "ذوق و شوق" میں بھی ہے جو انہوں نے تیس برس بعد فلسطین میں لکھی تھی)۔ حقیقت اور تخیل کے ملاپ نے یہاں تمثیل کے پیرائے کا سہارا لیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال نثر نگار معلوم نہیں ہوتے بلکہ شاعر نظر آتے ہیں۔ اقبال کے ہاں رومانی نثر (یا ادب لطیف) کے نمونے عموماً مفقود ہیں لیکن یہ ٹکڑا اسی اسلوب نگارش کا حامل ہے:

"اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو، تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا، مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ باغ کے مالک نے اپنے ملازموں کو مالیوں کے پاس پھل کا حصہ لینے کو بھیجا لیکن مالیوں نے ہمیشہ ملازموں کو مار پیٹ کے باغ سے باہر نکال دیا اور مالک کے حقوق کی کچھ پروا نہ کی۔ مگر اے پاک سرزمین تو وہ جگہ ہے جہاں سے باغ کے مالک نے خود ظہور کیا تا کہ گستاخ مالیوں کو باغ سے نکال کر پھولوں کو ان کے نامسعود پنجوں سے آزاد کرے۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازت آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے

تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں بلالؓ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی"۔

(مقالات اقبال، ص ۷۰)

غزل کے عاشق مہجور کی ان والہانہ کیفیات پر نظر ڈالیے جو کوچۂ محبوب کے آس پاس پہنچ کر اس پر طاری ہوتی ہیں اور پھر اس منشوق غزل پر دوبارہ ایک نگاہ ڈالیے۔ غزل کی پوری روایت کا رس نثر کے اس ٹکڑے میں سمٹ آیا ہے۔

ایسی ہی ایک کیفیت کا نقشہ اقبال نے اپنے دوسرے سفری مضمون میں پیش کیا ہے۔ لیکن یہاں متاثر ہونے والے سید علی امام ہیں اور تأثر کا یہ اظہار لفظوں میں نہیں بلکہ ان آنسوؤں میں ہوا ہے جو وفور شوق مس شدت جذبات سے بے اختیار امڈ آئے ہیں۔ اقبال نے اس موقع کی صرف تصویر بنا کر اس لمحے کو حیات جاوداں بخش دی ہے:

"سید علی امام صاحب کی مغرب زدگی کی کیفیت یہ ہے کہ ایک روز صبح کے وقت عرشہ جہاز پر کھڑے تھے، میں بھی ان کے ہمراہ تھا، میل و فرسنگ کا حساب کر کے کہنے لگے "دیکھو بھائی اقبال! اس وقت ہمارا جہاز ساحل مدینہ کے سامنے سے گزر رہا ہے" یہ فقرہ ابھی پورے طور پر ان کے منہ سے نکلا بھی نہ تھا کہ آنسوؤں نے الفاظ پر سبقت کی"۔

(گفتار اقبال، ص ۳۳)

جذبات سے معمور خیال افروز نثر کے اس قسم کے نمونے اقبال کی نثر میں بہت کم ملیں گے۔ لیکن ان سے یہ ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ

پہلے سفر (۱۹۰۵ء) میں عدن کے قریب پہنچ کر ساحل عرب کے تصور نے اقبال کے دل میں وفور شوق کی جو کیفیت پیدا کی اس کا اظہار انہوں نے عجیب والہانہ انداز میں کیا ہے۔ جذب و جنوں کا یہ وہ مقام ہے جہاں عقل کے پر جلتے ہیں - یہاں اقبال سراپا وادی عشق کے رہرو ہیں اور اسی کیف و مستی کے عالم میں دیار محبوب ؐ پر نگاہ ڈالتے ہیں (یہی کیفیت اقبال کی مشہور نظم ''ذوق و شوق'' میں بھی ہے جو انہوں نے تیس برس بعد فلسطین میں لکھی تھی)۔ حقیقت اور تخیل کے ملاپ نے یہاں تمثیل کے پیرائے کا سہارا لیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال نثر نگار معلوم نہیں ہوتے بلکہ شاعر نظر آتے ہیں - اقبال کے ہاں رومانی نثر (یا ادب لطیف) کے نمونے عموماً مفقود ہیں لیکن یہ ٹکڑا اسی اسلوب نگارش کا حامل ہے :

''اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو، تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا، مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ باغ کے مالک نے اپنے ملازموں کو مالیوں کے پاس پھل کا حصہ لینے کو بھیجا لیکن مالیوں نے ہمیشہ ملازموں کو مار پیٹ کے باغ سے باہر نکال دیا اور مالک کے حقوق کی کچھ پروا نہ کی - مگر اے پاک سرزمین تو وہ جگہ ہے جہاں سے باغ کے مالک نے خود ظہور کیا تا کہ گستاخ مالیوں کو باغ سے نکال کر پھولوں کو ان کے نامسعود پنجوں سے آزاد کرے - تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازت آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے

تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں بلال رض کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی''۔

(مقالات اقبال، ص ۷۰)

غزل کے عاشق مہجور کی ان والہانہ کیفیات پر نظر ڈالیے جو کوچۂ محبوب کے آس پاس پہنچ کر اس پر طاری ہوتی ہیں اور پھر اس منثوق غزل پر دوبارہ ایک نگاہ ڈالیے - غزل کی پوری روایت کا رس نثر کے اس ٹکڑے میں سمٹ آیا ہے۔

ایسی ہی ایک کیفیت کا نقشہ اقبال نے اپنے دوسرے سفری مضمون میں پیش کیا ہے۔ لیکن یہاں متاثر ہونے والے سید علی امام ہیں اور تأثر کا یہ اظہار لفظوں میں نہیں بلکہ ان آنسوؤں میں ہوا ہے جو وفور شوق مں شدت جذبات سے بے اختیار امڈ آئے ہیں - اقبال نے اس موقع کی صرف تصویر بنا کر اس لمحے کو حیات جاوداں بخش دی ہے :

''سید علی امام صاحب کی مغرب زدگی کی کیفیت یہ ہے کہ ایک روز صبح کے وقت عرشہ جہاز پر کھڑے تھے، میں بھی ان کے ہمراہ تھا، میل و فرسنگ کا حساب کر کے کہنے لگے ''دیکھو بھائی اقبال! اس وقت ہمارا جہاز ساحل مدینہ کے سامنے سے گزر رہا ہے'' یہ فقرہ ابھی پورے طور پر ان کے منہ سے نکلا بھی نہ تھا کہ آنسوؤں نے الفاظ پر سبقت کی'۔

(گفتار اقبال، ص ۳۳)

جذبات سے معمور خیال افروز نثر کے اس قسم کے نمونے اقبال کی نثر میں بہت کم ملیں گے۔ لیکن ان سے یہ ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ

اگر وہ اس قسم کی نثر لکھنے پر آتے تو رومانی نثر نگاروں میں اھم مقام حاصل کر لیتے۔

اقبال کی ادبی نثر کا ایک اور پہلو بھی قابل ذکر ھے۔ یہ شوخی، زندہ دلی اور بذلہ سنجی کا پہلو ھے۔ اقبال عام طور پر متانت کے دامن کو کبھی بھی ھاتھ سے نہیں چھوڑتے لیکن بعض اشخاص کے ساتھ ان کے روابط اس قسم کے تھے کہ ان کا ذکر آ جائے یا وہ انہیں خط لکھیں تو اپنی طبیعت کے اس دبے ہوئے جوھر کو وہ چھپا بھی نہیں سکتے تھے۔ مولانا گرامی کی شخصیت سے اقبال کو جو محبت تھی اور اس محبت میں بے تکلفی کا جو رنگ تھا، اس کا تقاضا تھا کہ ان کے بارے میں شوخی کا وہ انداز اختیار کیا جائے جو اقبال کی خاص نجی صحبتوں کی پر بہار کیفیتوں کا حامل ہوتا تھا۔ یہی حال ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا ھے جو اقبال کی بزم طرب کے ایک نمایاں کردار تھے، اور اقبال انہیں ماسٹر صاحب کہہ کر بے تکلفی سے یاد کرتے ھیں۔ ان حضرات کے ساتھ تفریح طبع کی یہ صورتیں ملاحظہ ھوں:

''گرامی صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ محرم میں تشریف لائیں گے مگر الکوفی لایوفی، اب معلوم نہیں کہاں تشریف رکھتے ھیں۔ عرصہ سے ان کا خط بھی نہیں آیا''۔

(مکاتیب اقبال، بنام نیاز الدین، ص ۱۰)

''گرامی صاحب تو امام غائب ھوگئے معلوم نہیں اس غیبت صغری کا زمانہ کب ختم ھوگا''

(مکاتیب اقبال، بنام نیاز الدین، ص ۱۰)

''گرامی صاحب نے شاید ملک الموت کو کوئی رباعی کہہ کر ٹال دیا ھے اور کیا تعجب کہ ھجو کہنے کی دھمکی دے دی ھو''۔

(مکاتیب اقبال، بنام نیاز الدین صفحہ ۱۳)

''گرامی صاحب بیماری کے خوف سے سنا ھے خانہ نشین ھیں۔ ان کی جگہ ان کا خط آیا تھا۔ ان کے خود آنے کی یہاں کسی کو توقع نہیں''۔

(مکاتیب اقبال، بنام نیاز الدین، ص ۱۴)

''گرامی صاحب کی تپ کوئی نئی بات نہیں۔ شاعروں کو قدرتی تپ ہوتی ھے''۔

(مکاتیب اقبال، بنام نیاز الدین، ص ۹۷)

''اس پیش گوئی کے لیے کہ گرامی لاھور کبھی نہ آئے گا کسی پیغمبر کی ضرورت نہیں۔ جالندھر اور ھوشیارپور کا ھر شیر خوار بچہ بلا تامل ایسی پیش گوئی کر سکتا ھے''۔

(مکاتیب اقبال، بنام گرامی، ص ۱۳۷)

''گرامی سال خوردہ ھے، یعنی سالوں اور برسوں کو کھا جاتا ھے۔ پھر بوڑھا کیوں کر ھو سکتا ھے۔ بوڑھا تو وہ ھے جس کو سال اور برس کھا جائیں''۔

(مکاتیب اقبال، بنام گرامی، ص ۱۵۱)

گرامی کے ساتھ یہ بے تکلفی اور بذلہ سنجی ایک مقام پر انشاء پردازی کے ساتھ مل کر اسلوب کا یہ انوکھا روپ بھی دکھاتی ھے:

''گرامی کو خاک پنجاب جذب کرے گی یا خاک دکن؟ اس سوال کے جواب کے لیے حسب الحکم مراقبہ کیا، جو انکشاف ھوا معروض ھے۔ گرامی ''مسلم'' ھے اور ''مسلم'' تودۂ خاک نہیں کہ خاک اسے جذب کر سکے۔ یہ ایک قوت نورانیہ ھے کہ جامع ھے جواھر موسویت و ابراھیمیت کی۔ آگ اسے چھو جائے تو برد و سلام بن جائے۔ پانی اس کی ھیبت سے خشک ھو جائے۔ آسمان و زمین میں یہ سما نہیں سکتی کہ یہ دونوں ھستیاں اس میں سمائی ھوئی ھیں۔ پانی آگ کو جذب کر لیتا ھے، عدم بود

کو کہا جاتا ہے، پستی بلندی میں سما جاتی ہے، مگر جو قوت جامع اضداد ہو اور محلل تمام تناقضات کی ہو، اسے کون جذب کرے؟ مسلم کو موت نہیں چھو سکتی کہ اس کی قوت حیات موت کو اپنے اندر جذب کر کے حیات و ممات کا تناقض مٹا چکی ہے''۔

(مکاتیب اقبال، بنام گرامی، ص ۱۴۷)

عبداللہ چغتائی کے بارے میں خطوط میں کچھ زیادہ باتیں نہیں ملتیں، صرف زبانی روایتیں ہیں جن کے اظہار کا یہ محل نہیں - صرف ایک نمونہ ان کے کردار پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہو گا - انہی کے نام ایک خط میں پوچھتے ہیں :

''تمام لاہور میں اس بات کا چرچا ہے کہ ماسٹر عبداللہ اعلان آزادی کے خوف سے کہیں بھاگ گئے ہیں - کیا یہ واقعی درست ہے؟''

(اقبالنامہ، حصہ دوم، ص ۳۰)

خواجہ حسن نظامی کے ساتھ اسرار خودی کے معاملے میں اگرچہ کچھ تلخی ہو گئی تھی لیکن خواجہ صاحب بھی اقبال کے ایسے ہی بے تکلف احباب میں سے تھے جن سے وہ شوخی آمیز پیرائے میں گفتگو کر سکتے تھے - اپنے اس دیرینہ دوست کو اقبال اسرار قدیم، پر اسرار نظامی، پیارے نظامی کہہ کر خطاب کرتے ہیں - ایک خط میں تو اقبال کا انداز ایسا ہو گیا ہے جیسا غالب کے ان خطوط کا ہے جو مرزا نے میاں خداداد سیاح کے نام لکھے ہیں - ملاحظہ ہو :

''سرمست سیاح کو سلام، متھرا، ہردوار، جگن ناتھ، امر ناتھ جی سب کی سیر کی - مبارک ہو، مگر بنارس جا کر لیلام ہو گئے - کیوں، ٹھیک ہے نا - بلکہ ہمارے میر صاحب نیرنگ اور اکرام کو بھی ساتھ لے ڈوبے - میرے پہلو میں ایک چھوٹا سا بت خانہ

ہے کہ ہر بت اس صنم کدے کا رشک صنعت آذری ہے - اس پرانے مکان کی کبھی سیر کی ہے؟ خدا کی قسم بنارس کا بازار فراموش کر جاؤ''۔

(اقبالنامہ، حصہ دوم، ص ۳۰۶)

بے تکلفانہ راز و نیاز اور شوخی، ظرافت اور بذلہ سنجی کے ان پر اسرار دریچوں کے ذریعے ہم ایک دانائے راز فیلسوف کے خلوت کدے کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں ' صرف ایک جھلک! یہ وہ بزم طرب ہے جہاں خاص خاص احباب اور عزیزوں سے ہنسی خوشی اور دل لگی کی باتیں ہوتی ہیں - جہاں کوئی دوسرا بار نہیں پا سکتا -

شبلی کے تعریضی حربے جو ان کی تحریروں میں جملہ ہائے معترضہ کی صورت میں دفعتاً آتے ہیں اقبال کے ہاں بھی کبھی کبھی آ جاتے ہیں لیکن ان میں نوک خنجر کی وہ نشتریت کم ہوتی ہے جو شبلی کا خاصہ ہے - یہاں تو زیادہ سے زیادہ نوک خار کی چبھن محسوس ہو گی - البتہ نقطہ نظر وہی ہے - ایک جگہ لکھتے ہیں :

''مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے - میں نے آغا خان کو باوجود ان کی تمام کمزوریوں کے ان سب سے بہتر مسلمان پایا''۔

(اقبالنامہ حصہ اول، ص ۱۶۹)

ایک جگہ مستشرقین یورپ کی علمی خدمات کے پس پردہ کارفرما استعماری مقاصد کی قلعی کس بلاغت کے ساتھ کھولی ہے :

''جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے فرانس، جرمنی، انگلستان اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاق حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے - سادہ لوح مسلمان طالب علم اس طلسم میں گرفتار ہو کر گمراہ ہو جاتا ہے''۔

(اقبالنامہ، حصہ اول، ص ۳۹۸)

خطوط میں کہیں کہیں بے ساختہ طور پر رعایت لفظی کی کوئی صورت یا استعارہ، تلمیح، تمثیل، تشبیہ اور محاورے کے استعمال کا کوئی موقع آ جاتا ہے تو اقبال اسے نظر انداز نہیں کر دیتے۔ اس سے ان کے خطوط میں ادبی چاشنی پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہ ان کا خاص رنگ نہیں ہے:

"وسط ایشیا کی ہانڈی ابل رہی ہے، خدا تعالیٰ اپنا فضل کرے"۔

(مکاتیب بنام نیاز، ص ۳۴)

"آج کل گرمی سخت ہے۔ بارش مطلق نہیں ہوئی۔ فکر سخن کے لیے یہ موسم نہایت خراب ہے۔ تاہم کبھی کبھی شبنم کی کوئی نہ کوئی بوند برس جاتی ہے"۔

(مکاتیب بنام نیاز، ص ۵۰)

"بھائی شوکت، اقبال عزلت نشیں ہے اور اس طوفان بے تمیزی کے زمانے میں گھر کی چار دیواری کو کشتی نوح[۳] سمجھتا ہے"۔

(اقبالنامہ، حصہ اول، ص ۲۰۰)

"علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے"۔

(اقبالنامہ، حصہ دوم، ص ۱۶۶)

"کسی روز ضرور ملیے۔ آپ کی "فوقیت" اب اس قدر بلند ہو رہی ہے کہ نظر ہی سے غائب ہو گئی"۔

(محمد الدین فوق کے نام خط، انوار اقبال، ص ۶۵)

چیمبر آف پرنسز کے لیے دیسی نام کی تلاش تھی، کسی نے "مہندرا منڈل" نام تجویز کیا۔ اقبال کی رگ ظرافت پھڑکی، نیاز کو لکھتے ہیں:

"مہندرا منڈل" کی کسی کو خوب سوجھی۔ لیکن تعجب ہے کہ وہ "اندر سبھا" کو نظر انداز کر گئے"۔

(مکاتیب اقبال، ص ۲۷)

کبھی سیدھی سادی بات میں تھوڑی سی معنوی رعایت پیدا کر

کے فقرے کو ادبی لحاظ سے چست کر دیتے ہیں۔ نیاز الدین کو ایک خط میں ان کے ارسال کردہ کبوتروں کے جوڑے کے بارے میں یہ اطلاع دیتے ہیں:

"کبوتر موجود ہیں مگر مشکلوں سے بچے پالتے ہیں۔ بڑی دیر کے بعد ایک جوڑے نے بچوں کی پرورش کی ہے"۔

(مکاتیب اقبال، ص ۴۰)

اس سادا سی بات کو ایک دوسرے خط میں ذرا سا ظریفانہ پیچ دے کر یوں دلچسپ بنا دیا ہے:

"آپ کے کبوتر بہت اچھے ہیں۔ مگر افسوس کہ زمانہ حال کی مغربی تہذیب سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ بچوں کی پرورش سے بہت بیزار ہیں"۔

(مکاتیب اقبال، ص ۳۹)

اقبال کے خطوط میں یہ ادبی پھلجڑیاں خال خال نظر آتی ہیں۔ دوسرے مضامین اور اپنی علمی تحریروں میں تو انہوں نے اسلوب نگارش کی ظاہری آرائش سے اتنا بھی اعتنا نہیں کیا۔ اگرچہ اقبال کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں تھا کہ وہ بھی ظفر علی خان کی طرح دہلی اور لکھنؤ کے زبان و بیان کے دعوے داروں کو دعوت مبارزت دیتے اور مولانا کی طرح انہی کے الفاظ میں ادبی داؤ پیچ میں "اڑنگے پر لا کر" انہیں ایسی "پٹخنی" دیتے کہ پھر کوئی زباندانی کا جھوٹا دعویٰ نہ کرتا، لیکن اقبال نے ایسا نہیں کیا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ان کی نثر ایک فیلسوف کی حکیمانہ نثر نہ ہوتی۔ یہ بات اقبال کے مزاج کے خلاف تھی۔

اقبال نے ایک ایسے زمانے میں اردو زبان کو فلسفہ، حکمت اور سائنس کے رموز سے آگاہ کیا جب مشرقی و مغربی علوم میں معانقہ ہو رہا تھا اور اقبال مغرب کی استعماری برتری سے مرعوب ہوئے بغیر مشرق و مغرب کے علمی ارتباط کے بہ صدق دل خواہاں تھے:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر!
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اردو میں اس کام کے لیے صرف زبان دانی ہی کافی نہ تھی بلکہ ان علوم کا ادراک بھی ضروری تھا جنہیں اردو اپنی آغوش میں لینا چاہتی تھی - یہ اچھا ہوا کہ یہ ادراک پنجاب کے ایک ایسے سپوت کو ارزانی ہوا جو لسانی شعور رکھنے کے علاوہ عربی، فارسی، انگریزی، جرمن، زبانوں سے بھی آگاہ تھا اور اپنے ماحول کی فطری بولی ''پنجابی'' کے محاورے سے بھی حسب ضرورت کام لینے میں کوئی حجاب محسوس نہیں کرتا تھا - خود اردو زبان کے اسلوب پر اس کی گرفت اتنی قوی ہے کہ اس اعتذار کے باوجود کہ ''میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا'' انہوں نے اردو زبان کی بیش بہا خدمت انجام دی -

اقبال ایک صاحب طرز اسلوب نگار ہیں اور اس طرز بیان کا بنیادی وصف حکیمانہ رنگ ہے جسے اتنی خود اعتمادی اور بصیرت کے ساتھ اردو میں کسی نے نہیں برتا تھا - اگرچہ یہ بات اقبال نے سید سلیمان ندوی کی نثر کے بارے میں کہی ہے کہ ''آپ کی نثر معانی سے معمور ہونے کے علاوہ لٹریری خوبیوں سے بھی مالا مال ہوتی ہے'' لیکن یہ بات خود ان کی اردو نثر اور اسلوب نگارش پر زیادہ صادق آتی ہے -

ARMS SALES AND THE OIL CRISIS*

AKMAL HUSSAIN

Introduction

Given the increasing dependence of the U.S. on oil from the Middle East, the five fold increase in the price of oil in 1973 has thrown the U.S. and other advanced capitalist countries into an economic crisis. At the same time the U.S. Sales of arms to the Middle Eastern countries have been increasing rapidly. In this essay I will attempt to show the relationship between these two tendencies—And in so doing I hope to indicate the framework within which US Policy towards the Middle East can be understood.

The Growing U.S. Dependence on Oil from the Middle East

The U.S. Imports about 36 per cent of its total consumption of oil. This dependence on imported oil is expected to increase further, so that by 1980, it is estimated that the U.S. will import 50 per cent of its oil requirements.[1] The reason for this is that while the U.S. oil production remains static, its consumption is growing at an annual rate of 5 per cent.

What is alarming for the U.S. is that while its dependence on oil imports is increasing, its dependence on the Middle East for its imports is also growing rapidly. At the moment the U.S. imports of oil from the Middle East constitute 30 per cent of its total oil imports. This percentage is likely to increase because of the rapidly increasing share of the Middle East in the world oil production. Thus the Middle East (including Iran) accounted for about 70 per cent of total world exports in 1972. Moreover, the share of only three Middle East countries (Saudi Arabia, Iran and Kuwait) in the increased volume of world oil exports between 1969 and 1972 was over 60 per cent (see Table 1).

*This paper was presented at a South Asian Semister on the Oil Crises, on 6th May, 1975.

TABLE 1

Exports of Oil, 1969 to 1972

(*Million Barrels Annually*)

Country	1969	Percentage of World Oil Exports	1972	Percentage of World Oil Exports
1. Saudi Arabia	1158	(14.1)	2163	(19.7)
2. Iran	1158	(14.1)	1752	(15.9)
3. Kuwait	1006	(12.3)	1176	(10.7)
4. Venezuala	1245	(15.2)	1133	(10.3)
5. Libya	1131	(13.8)	813	(7.4)
6. Nigeria	—	—	628	(5.7)
7. Abu Dhabi	219	(2.7)	384	(3.5)
8. Iraq	529	(6.4)	382	(3.5)
9. Algeria	330	(4.0)	373	(3.4)
10. Canada	—	—	312	(2.8)

Source: Hafiz A. Pasha: The Oil Crisis in UBL, *Monthly Economic Letter*, February 1974.

We see therefore that not only is the U.S. dependent on Middle Eastern Oil, but that this dependence is increasing rapidly as the oil output from the Middle East constitutes a rapidly growing percentage of world output of oil.

Growing Arms Sales to the Middle East

Associated with this increasing dependence of the U.S. on oil imports from the Middle East has been a rapid increase in the sales of U.S. arms to this region. U.S. arms exports rose from $ 1.00 billion in 1961 to $ 3.4 billion in 1971 and further increased to $ 8.5 billion in 1973-74.[2] The 1973-1974 figure represents a doubling of the previous year and is accounted for by almost $ 4 billion arms sales to Iran, $ 1 billion to Israel and $ 700 million to Saudi Arabia.

Energy Crisis and Arms Sales

Underlying the phenomenon of growing U.S. dependence on Middle Eastern oil on the one hand and the rapid increase in U.S. arms sales to this

region on the other, are two sets of factors that I will attempt to analyse briefly :

(*i*) Factors that are rooted in the structural changes that have taken place in the U.S. economy since the last three decades.

(*ii*) Factors associated with the five fold increase in the price of oil and the consequent large increase in the oil revenues of the Middle Eastern Countries.

Structural Changes : Militarization of the U.S. Economy

Since the Korean war the U.S. has been spending between 8 per cent to 11 per cent of its GNP on defence, which is an average of over $ 80 billion a year. The employment effect of defence expenditure is also substantial. An annual defence expenditure of $ 80 billion directly employs about 7 to 8 million people which is about 10 per cent of the labour force. The indirect effect of this expenditure (i.e., the multiplier effect, which is the number of jobs created by the spending of those who directly get their income from defence spending) has been estimated at 7 million jobs. Thus approximately 20 per cent of the work force depends on the defence expenditure.[3]

We have seen therefore that the military sector of the U.S. economy is of a massive size. However, the popular liberal view is that this sector although large is an 'enclave' i.e., it is isolated from the rest of the economy. Evidence shows that this 'enclave' image of the military sector is incorrect. We find on the contrary that the military production through a system of contracts and sub-contracts to private civilian industries is in fact diffused throughout the economy, and affects the very structure of this economy. Consider the following evidence :

(*i*) Nathanson estimates[4] that of the 500 largest manufacturing corporations in 1964, at least 205 were involved in military contracts. Of the largest 25 corporations in the U.S. in 1968, all except five were among the 100 largest contractors for the defence Department.[5]

These large corporations which apart from their civilian production accept contracts from the military are by no means an enclave. They constitute rather the very fabric of the U.S. economy.

TABLE 2

Sectoral Distribution of Private Employment Attributable to Military Expenditures in 1967

	Sector	Percentage of total Military Related Employment in Sector
1.	Agriculture, Forestry & Fisheries	2.5
2.	Mining	1.3
3.	Construction	2.3
4.	Ordnance and Accessories	6.2
5.	Textile and Apparel Products	3.4
6.	Chemicals and Allied Products	2.1
7.	Petroleum and Refining	0.5
8.	Other Non-durable Goods Manufacturing	3.5
9.	Rubber and Plastic Products	1.1
10.	Primary Metals	4.5
11.	Fabricated Metals	2.9
12.	Machinery not Electrical	5.9
13.	Electrical Equipment and Supplies	13.3
14.	Aircraft and Parts	16.0
15.	Other Transportation Equipment	3.2
16.	Instruments	1.9
17.	Other durable Goods Manufacturing	2.6
18.	Miscellaneous Manufacturing	0.3
19.	Transportation and Warehousing	6.9
20.	Communications and Public Utilities	2.1
21.	Wholesale and Retail Trade	5.6
22.	Finance, Insurance and Real Estate	2.1
23.	Business Services	4.3
24.	Medical, Educational Services and Nonprofit Organizations	3.2
25.	Other Services	1.7
	Total Manufacturing	68.0
	Total, all private employment	100.0

Source: R. Oliver · The Employment Effect of Defence Expenditure, *Monthly Labour Review*, September, 1967.

(*ii*) Apart from the corporations which have direct contracts for military production, there is a wide range of firms which receive sub-contracts from the primary contractors. These sub-contractors produce intermediate goods, components or supply raw materials for the corporations which produce the final product for the military. This indirect impact, as Reich and Finkelhor show "ties military spending to the very heart of the U.S. Economy"[6]. For evidence see Table 2, which shows the wide range of industries which were directly or indirectly affected by Military spending in 1967.

(*iii*) There is a rapidly growing tendency for firms in the civilian market to diversify into defence production. Thus between 1959 and 1962 (years for which a study was done) "Manufacturing firms outside the defence sector purchased 137 companies in the defence sector (i.e., aircraft and parts, ships and boats, ordnance etc.)." Of the top 500 corporations which had traditionally produced for the civilian market, 93 corporations had diversified into the defence sector by 1966.[7]

From the evidence presented above it appears that the huge military sector far from being an isolated 'enclave' is in fact closely integrated with the rest of the economy. So large is the military sector and so wide ranging its integration with the rest of the economy, that the U.S. economy is structurally dependent[8] on military production. This dependence is growing rapidly as more and more traditionally civilian based firms are diversifying into military production.

Apart from the massive diversion of resources into military production and the consequent dependence of the civilian sector of the economy on military contracts, the technological development in the U.S. has also been predominantly directed towards military products. Thus during 1960 to 1973, between 77 per cent to 91 per cent of total government research and development expenditure went into the defence industry. This can be seen in the following Table 3.

TABLE 3

Federal Expenditures for Research and Development

	1960	1965	1969	1975
Total Expenditure	7,300	13,811	15,695	16,584
National Defence and Space Research & Technology*	6,665	12,425	13,244	12,759
Percentage of Total	91.3%	89.97%	83.4%	76.93%

*The categories 'National Defence' and 'Space Research and Technology' are according to Chris Paine "Virtually indistinguishable categories, as NASA is heavily influenced by USAF research objectives, and largely the same companies perform research and development in both areas."

As a result of research and development funds flowing predominantly into the military sector, the U.S. civilian technology has lagged behind that of Europe and Japan.[9] Thus U.S. manufactured exports have become less competitive and even the U.S. market in vital industries like steel and railway engines has been penetrated by European and Japanese manufacturers.[10] This loss of competitiveness of U.S. manufactured exports on the one hand, and the huge import expenditures involved in maintaining bases abroad, resulted in a severe balance of payments crisis in the late sixties and early seventies. Nixon was forced to order a wage freeze, which was followed by a devaluation of the dollar.

It was realized that an important way to improve the balance of payments and maintain the growth of national income was to export the one category of manufactured goods in which the U.S. had a clear advantage namely military equipment. Accordingly, systematic efforts were made to increase the sale of arms abroad. Thus we find an interesting shift taking place in the Composition of U.S. arms exports : from grants to sales e.g., in 1953 the U.S. gave $ 1.96 billion as grants and sold arms worth only $ 0.23 billion. In 1968 the grant aid had diminished to $ 0.466 billion while sales had increased to $ 1.5 billion.

We, therefore, find that the U.S. Sales of Arms abroad is an imperative flowing from structural changes that have 'militarized' the U.S. economy.

These arms exports have now become a major instrument of maintaining economic growth and the balance of payments. In the next section we will analyse how following the oil crisis, U.S. arms exports to the Middle East have acquired a vital additional function : to provide a political leverage over the Middle East countries and thereby enable U.S. in maintaining a dominant position in the increased Inter-Imperialist rivalry following the oil price increase.

Oil Price Increase : Balance of Payments Crisis and Inter-Imperialist Rivalry

Consider now the second set of factors underlying the U.S. arms exports to the Middle East—the factors associated with the increase in oil prices. Between 1971 to 1973 oil prices increased by over five times. As a result the combined Arab Oil revenues increased from $ 6 billion in 1971 to $ 60 billion in 1974. On the basis of different assumptions regarding the growth of world trade in oil by 1980, it has been estimated that the total oil revenues to Arab producers will go up to between $ 110 billion to $ 150 billion by 1980. This corresponds to the combined export of W. Germany, France, Italy and the U.K. in 1972.[11]

While Arab Oil revenues have increased by such phenomenal amounts, the advanced capitalist countries have suffered an increase in their oil import bills that has thrown their balance of payments into a crisis. This can be seen in the following Table 4 which shows the balance of trade of advanced capitalist countries before and after the increase in the price of oil.

Table 4 shows that before the increase in the price of oil, out of the major advanced capitalist countries only Canada, Britain and France had a balance of payments deficit. The OECD forecasts show that as the direct result of the oil price increase, other things remaining the same every advanced capitalist country would be suffering substantial balance of payments deficits. These deficits would range between $ 4.1 billion in the case of Britain to $ 9.1 billion in the case of Japan.

Now the extent to which any particular capitalist country can improve its balance of payments depends on the extent to which it can retain or

TABLE 4

Estimated Balance of Trade of Major Advanced Capitalist Countries in 1974

($ *billion*)

Country	Before Higher Oil Price	1974 Forecasts* Extra Cost of Formal Oil Imports
United States	1.0	−9.1
Canada	−0.7	−0.8
Japan	0.9	−9.1
France	0.2	−5.0
Britain	−2.8	−4.1
Germany	3.9	−5.9
Italy	−1.8	−4.1
Holland	2.2	−1.7
Other OECD countries	1.3	−8.3

*Normal Level of Imports is defined as the pre-embargo level of Imports in 1973.

Source : Hafiz A. Pasha, *UBL Monthly Figures from OECD estimates.*

increase its share of exports to the middle east market which at the moment is worth $ 60 billion and is likely to increase to between $ 110 to $ 150 billion by 1980.

How far each capitalist country will be able to maintain its level of prosperity and economic growth depends on how successful it is in resolving its balance of payments crisis by retaining or increasing its share of exports to the huge Middle East Market. Clearly such a situation will accentuate the rivalry and contention between the imperialist powers. Unless it is controlled through some consensus this rivalry could increase to such an extent that it could threaten the very social and economic system of advanced capitalist countries. Such rivalry has already expressed itself in the break down of the Bretton Woods monetary system and the elimination of the dollar as a reserve currency. At a political level, the weakening of the

advanced capitalist powers has expressed itself in the weakening of NATO, the partial U.S. withdrawal from this alliance, and finally lack of a unified policy towards the Arab countries. It is in this context of the growing contention and divisiveness between the advanced capitalist countries that one can understand Kissinger's persistent efforts to emphasise the interdependence between capitalist countries and to bring about a coordination in the economic policies of advanced capitalist countries. In an interview to James Reston in the *New York Times* last year, Kissinger said :

"If we do not get a recognition of our interdependence, the Western civilization that we now have is almost certain to disintegrate because it will first lead to a series of rivalries in which each region will try to maximize its own special advantages. That invitably will lead to tests of strength of one sort or another. These will magnify domestic crises in many countries, and they will move more and more to authoritarian models. I would expect then that we will certainly have crises which no leadership is able to deal with, and probably military confrontations, you will certainly, in my view, have systematic crises similar to those of the twenties and thirties."[12]

Inter-Imperialist Rivalry and Counteracting Forces

Kissinger has drawn a parallel between the situation in the thirties and the present situation. An analysis of this parallel would perhaps cast an interesting light on the nature of the inter-imperialist rivalry generated by the oil crisis and the possibilities for the future.

The crisis of the thirties followed structural changes in the industrialized capitalist economies. The competitive atmomistic market structure of the 19th century when the typical productive unit was the small firm, had developed into a monopolistic market structure by the early 20th century when the typical productive unit had become the large monopolistic firm. Consequently firms could now control their price and this resulted in a massive accumulation of profit. Monopolist firms avoided reinvesting this profit in the saturated domestic markets in order to maintain profits. Consequently investment declined and unemployment increased dramatically. The absence

of investment opportunities at home, created pressure to export capital and consumer goods to the 'third world countries'. Associated with this was the attempt by each capitalist country to establish its markets abroad and insulate it from its competitors. It was this rivalry to look for markets abroad following the depression within advanced capitalist countries, that generated serious divisive forces. In the absence of international institutions of cooperation and the absence of a clearly dominant imperialist power which could provide the leadership to create these institutions, the inter-imperialist rivalry became one of the important factors leading to World War II.

Since the Second World War capitalist development has brought changes in the advanced capitalist economy which has altered the nature of inter-imperialist rivalry. I will very briefly analyse these changes to show that although inter-imperialist rivalry could affect the foreign policies of the imperialist countries, and even bring about a redistribution of economic and political power, yet the forces tending towards cooperation and inter-dependence are sufficient to prevent an actual military confrontation between the imperialist powers.

The market structure of the early twentieth century was characterised by firms which although monopolistic, were 'national' in character i.e., they operated predominantly within their country of origin.

Over the years the market structure of the early 20th century has changed, such that today we have multinational corporations, which are operating in a number of different countries. Associated with the emergence of the multinational firm is a growing economic interdependence between the advanced capitalist countries. This can be seen from two aspects of the post-war economic growth of the advanced capitalist bloc.

1. Growth of national income of these countries is becoming increasingly dependent on trade with each other. Thus we see that in the post-war period exports as well as imports of advanced capitalists countries have grown at a much faster rate than the domestic output of these countiries.[13] And most of this trade has been between the advanced capitalist countries themselves.[14]

2. Apart from exports, direct investment abroad has also played an important role in the economic expansion of at least five countries : Britain, the United States, the Netherlands, Canada and Switzerland. It has been estimated[15] for example, that in 1966 the sales of American manufacturing and petroleum affiliates in Europe were equal to about $ 36,000 million. The sales of European manufacturing and petroleum affiliates in the U.S. though smaller was nevertheless significant : about $ 9,000 million. It is clear, therefore, that there is a growing *inter-penetration* of capital between the advanced capitalist countries. For details of the sales of overseas affiliates of firms of various advanced capitalist countries see the following Table 5.

TABLE 5

Manufacturing and Petroleum Sales of Local Subsidiaries of Foreign Firms

($ *millions*)

	1957	1966
Out of U.S.		
Europe	6,940	14,440
Japan	1,851	3,545
Into U.S.		
U.K., Netherlands & Switzerland	2,320	3,740
Other Europe	4,580	8,050
—France	690	1,050
—Germany	1,380	2,700
Japan	1,543	4,444

Source : Table constructed from Rowthorne Imperialism Unity or rivalry NLR 69, Table 2.

From the above two features of the post war economic growth of the advanced capitalist countries, it is clear that these countreires are getting increasingly inter-dependent in terms both of exports of manufactured goods as well as the growing interpenetration of capital between these countries.

This growing inter-dependence of the advanced capitalist countries has been reflected in the emergence of economic institutions like the IMF and the Bretton Woods monetary system to ensure stability in international trade, as well as organizations like the OECD and recently the ECM.

At a political level, there has been a recognition that despite their rivalry, there is an essential commonality of interests between the advanced capitalist countries. This consciousness has expressed itself in the rallying together of these countries whenever one or more of them has been threatened by a serious crisis in the post-war period. Thus during the dollar crisis in 1968, and again in 1971 all the capitalist countries came to the aid of the dollar. This was perhaps because it was recognized that the crisis endangered the capitalist system itself. So we have M. Albin Chalandon exclaiming before French Parliamentarians "for the sake of the Western World we must avoid the war of currencies.[16]

The oil crisis accentuated the rivalry between the advanced capitalist countries. Yet the tradition since the Second World War, of cooperation, the various social and economic institutions that this tradition has created and the underlying objective economic inter-dependence are powerful forces counteracting the rivalry. It is these forces that are being expressed in the initiatives being taken by the dominant, imperialist power, to bring back a policy of cooperation. We thus have Business Week of 13th January, 1975 reporting the text of Kissinger's interview :

"The Western World's most urgent economic problem is the quadrupling of oil prices over the past year. This has slowed the economies of industrialized countries to recession levels, and created gigantic financial deficits for every country except West Germany. Committed to a substantial reduction in oil prices, Kissinger has elected to achieve this the slow way by unified action of the consuming countries."[17]

In order to achieve this "United action of the consuming nations" and establish once again a framework of cooperation, within the imperialist bloc, the U.S. will have to achieve two intermediate objectives :

(1) Maintain its 'leadership' position in the bloc by maintaining its dominant economic position.

(2) Acquire a leverage over the Arabs so that the European and the Japanese are convinced that if they unite behind the U.S. they will get a better bargain on oil prices than if they negotiate separately.

U.S. arms sales to the Middle East could be a vital instrument of achieving both the above objectives. Large scale arms sales would strengthen the economic position of the U.S., and at the same time by making the Arab military machine dependent on the U.S., give the latter a powerful leverage over the oil producers. Finally, there is another advantage of arms sales which could further strengthen U.S. influence over the Arabs. This advantage lies in the fact that Israel is critically dependent on U.S. arms, and as the withholding of the supply of F-15 jet fighters[18] to Israel has shown, the U.S. can use arms sales in influencing Israel's policy towards the Arabs. This would demonstrate to the Arabs that the U.S. is an 'indispensable' negotiator for any solution to the Arab-Israel crisis. Thus U.S. hold over Israel through its arms sales, would give it the position of a useful 'friend' for the Arabs and thereby give the U.S. an additional influence.

Conclusion

In this essay I have attempted to analyse briefly the factors underlying the phenomenon of growing U.S. dependence on Middle East Oil on the one hand and the rapid increase in U.S. arms sales to the Middle East region on the other. I have shown that U.S. arms sales is an imperative both of the militarization of the U.S. economy, as well as the crisis of the imperialist bloc following the oil price increase. The large balance of payments deficits of many advanced capitalist countries and the corresponding increase in Arab Oil revenues has accentuated inter-imperialist rivalry. I have tried to argue that this rivalry is not likely to lead to an internal disintegration of imperialism, because of the powerful forces of inter-dependence and cooperation generated by post war economic growth. Post-war economic growth of advanced capitalist countries and the emergence of the multinational corporation, has made these countries increasingly dependent for their growth on trade with each other. At the same time high degree of foreign investment by the advanced capitalist countries in each others economies, has

brought about an inter-penetration of capital which is another important factor in inter-dependence. Given the objective basis and the emergence of a dominant imperialist power, it is likely that the intensified rivalry following the oil crisis can be controlled. An essential element in the attempt by the U.S. to establish such a control, may well be arms sales to the Middle East. For such sales would help maintain the economic position of the U.S. and also provide the U.S. with a leverage over the Arabs. Both these objectives would be vital elements in the U.S. initiative to resolve the oil crisis, and thereby mitigate the inter-imperialist rivalry that threatened the very foundations of imperialism.

REFERENCES

1. Hafiz A. Pasha : The Oil Crisis in UBL, *Monthly Economic Letter*, February, 1974.
2. United States Arms Control and Disarmament Agency estimates. Quoted in Chris Paine : The Political Economy of Arms Transfers to the Middle East. *MERIP Report No.* 30.
3. Michael Reich and David Finkelhor : Capitalism and the Military Industrial Complex : The Obstacles to Conversion. In David Mermelstein (ed.) *Economics* : *Mainstream Readings and Radical Critiques*, 2nd ed. (Random House 1973).
4. C. Nathanson : "Militarization of the American Economy", in *Corporations and the Cold War* 1969, p. 231.
5. Robert Heilbroner, *Limits of American Capitalism*, 1966, p. 36.
6. Reich and Finkelhor. See reference 3.
7. *Ibid.*
8. 'Structural Dependence' Refers to the Fact that a wide range of firms in the U.S. producing vital civilian products would collapse without contracts for military production. Thus the manufacture of civilian products of firms are being sustained in many cases on the basis of profits earned from their military production.
9. Seymour Melman reports : "In Industry after industry requiring quality engineering there has been a manifest falling off of the U.S. position". See *RAMPARTS* July, 1974, p. 37.

10. In the case of Steel 18 per cent of domestic U.S. consumption requirements are imported. In the case of railways, the government railroad Amtrak has to import trucks, trains from France because the domestically produced turbos have too many "mechanical difficulties". See Chris Paine, "Political Economy of Arms Transfers to the Middle East, in *MERIP Report No.* 30, p. 9.
11. See Ref. 1, Hafiz A. Pasha.
12. Text of Kissinger's Interview (Mimeo) 1974, *New York Times* Company.
13. R.E. Rothorn : "Imperialism : Unity or Rivalry"? in *New Left Review* 69, p. 37.
14. The fact that most of the growth in trade of advanced capitalist countries has been contributed by trade within the advanced capitalist bloc, can be seen from the following fact : "Trade within the advanced capitalist bloc is now three times as large as between this bloc and the rest of the world", *Ibid.*
15. *Ibid.*
16. P. Jalee : "*Imperialism in the Seventies.*"
17. Text of Henry Kissinger's Interview to *Business Week*, January 13, 1973. South Asian Institute Mimeograph.
18. *TIME* Magazine, April 28, 1975, p. 21.

THE IMPORTANCE OF STRESS IN SCANNING ENGLISH POETRY

IFTIKHAR AHMAD

The importance of correct stressing in the metrical analysis of English poetry is a phenomenon that has hardly been fully explored by the phoneticians. This paper is an attempt at discovering the significance of stress in appreciating English poetry. Not that stress is the only important factor in scanning poetry; there are other phonetic features as well which are equally relevant to its understanding, and in fact they can hardly be isolated from one another. But for purposes of classification it seems convenient to treat stress in isolation from other sound features while a study of the inter-relations obtaining between them certainly begs for a separate treatment. The value of stress varies in relation to the demands and expectations of the students of English poetry. Native speakers are almost unconsciously attuned to the rhythmic patterns of their language while the non-native speakers have to consciously learn the stress-patterns of English. The arrangement of stressed and unstressed syllables in a speech segment comprises a stress-pattern. These stress-patterns are more or less fixed, and some general statements can be made about them. A knowledge of these patterns is compulsory for foreign students as it will help them to bring out the inherent rhythm of English poetry. In the absence of such knowledge their appreciation of English poetry is bound to suffer and the systematic appeal of sounds in a poetic context shall ever remain a mystery to them. The very terminology of scansion is based on the presumption that the reader possesses a knowledge of the fundamental stress patterns of English Language. It is difficult to understand the concept of a metrical foot in English without understanding the concept of stress. The concept of stress is basic to metrical analysis. Metre is only a super-structure. In speech it is enought to recognize the presence and absence of stress, while metre recognizes not only stress and lack of stress but also the regular

occurrence and non-occurrence of stress; it looks at the speech segment as a pattern and the whole speech continuum as a complex of infinite number of patterns. At its best it is only a method of describing the sounds of poetry; it describes them in such a way that they exhibit close correspondence to the natural rhythm of ordinary speech. Stress is the real thing; it is inherent in the structure of English language. It is only due to the presence of stress phenomenon, perhaps, that English language has been described as the principally accented language, because each English word (leaving out, of course the monosyllables) is characterised by a principal stress.

The convenience of procedure demands that we should define our concepts. Phoneticians, too, have made attemps to define stress in various ways; mainly in psychological, acoustical and experimental terms. In spite of the divergence of their respective approaches, they agree on a common feature of stress which can be recognised on all levels. Stress may, thus be commonly defined as the amount of breath force involved in the articulation of phonetic as well as phonological syllables. In some languages stress is equated with prominence and its incidence on a syllable makes it phonetically conspicuous in relation to the adjacent syllables in a particular linguistic frame work. For purposes of description, two fundamental stress categories may be recognized (*i*) word or lexical stress and (*ii*) sentence or syntactical stress. The other types are only extensions of one of these categories, as for example 'metrical stress' is an extension of the syntactical stress: For purposes of detailed analysis it is useful to establish different degrees of stress e.g., primary, secondary, tertiary etc. or even strong and week forms of stress, but in an elementary account like this, the various degrees of stress are not of any immediate relevence and an attempt is made to restrict the analysis only to the dominant form of stress i.e., the primary stress or the strong form. The primary stress has been designated by Kingdon as 'kinetic stress', a kinetic stress is one 'with which a kinetic tone is associated', and a 'kienetic tone' is a tone in which the pitch of the voice varies throughout the entire duration of an articulation.

Word stress is applicable to words comprising more than one syllable. The reason that monosyllables are entered under lexical stress is their

autonomous status as lexical items. As a matter of fact, they are potential bearers of stress though their actual manifestation takes place in sentences. More accurately, they belong to the realm of syntactical stress. Monosyllables are divided into 'content' words (good, boy etc.) and 'form' words (of, into etc.). Content words are much more frequently associated with stress than the form words. Sentence stress may differ from word stress in either of two ways. Monosyllables which are generally left unstressed, may be associated with syntactical stress if they form functionally significant units in the sentence and words of more than one syllable may be characterised by absence of stress if they form functionally insignificant units in the sentence.

Though pitch-and-length differences are equally relevant in scanning English poetry, stress plays the most dominant role in giving a characteristic rhythm to the English speech. As a matter of fact, in the Germanic languages evident contrast of stressed and unstressed syllables is the most prominent and constant characteristic of verse as of prose, and the primary constituent in rhythmic structure. In English, unfortunately, although simple rules for stress incidence cannot be formulated, word stress is not marked in orthographic texts. Stress is partly free and partly pre-determined. The following are the classified examples of all the possible stress patterns that may be associated with dissyllabic and polysyllabic structures.

1. **Two-syllable words:**
   - (*a*) *able* (the stress is on the first syallble).
   - (*b*) *absurd* (the stress is on the second syllable).
   - (*c*) *bamboo* (the primary stress is on the second syllable but there are pitch differences in the articulation of its first syallable that differentiate it from the first syllable of 'absurd').
2. **Three-syllable words:**
   - (*a*) *average* (first syllable stressed)
   - (*b*) *external* (second syllable stressed)
   - (*c*) *half-hearted* (kinetic[1] stress on the second syllable and full 'static'[2] stress on the first syllable).
   - (*d*) *represent* (kinetic stress on the third syllable and low static stress on the first).

3. **Four-syllable words :**

(*a*) *agriculture* (first syllable stressed).
(*b*) *legality* (second syllable stressed).
(*c*) *expresident* (full static stress on the first syllable and kinetic stress on the second syllable).
(*d*) *advantageous* (full static stress on the first syllable and kinetic stress on the third syllable).
(*e*) *superimpose* (full static stress on the first syllable and kinetic stress on the fourth syllable).
(*f*) *examinee* (full static stress on the second sylllable and kinetic stress on the fourth syllable).

4. **Five-syllable words :**

(*a*) *speculatively* (first syllable stressed).
(*b*) *benevolently* (second syllable stressed).
(*c*) *inapplicable* (full static stress on the first syallable and kinetic stress on the second syllable).
(*d*) *abnormality* (full static stress on the first syllable and kinetic stress on the third syllable).
(*e*) *characteristic* (full static stress on the first syllable and kinetic stress on the fourth syllable).
(*f*) *impressionistic* (full static stress on the second syllable and kinetic stress on the fourth syllable).

Naturally all the patterns tabulated above do not occur with the same frequency. Some of them are of much common occurrence than the others. It may be stated as a general rule that patterns in which two stresses occupy adjacent syllables are much less frequent than those in which they are separated by one or two unstressed syllables. On the other hand patterns containing a series of more than two unstressed syllables also occur infrequently. Furthermore in words of more than three syllables final stresses are comparatively rare.

A large number of disyllabic structures showing *functional stress*[3] changes are those in which the word stressed on the prefix is a noun, while that stressed on the root is a verb. When the word 'convert' is stressed

on the first syllable (prefix) it is a noun, and when it is stressed on the second syllable (root) it is a verb.

Kingdon says : "The meaning of quite a number of English-type compounds—(an english-type compound is a semantic unit that has attained dictionary status, composed of two or more words written separately, joined by a hyphen, or as one word, and whose meaning may or may not be a straight forward combination of the meanings of its components—may be modified by a change of stress. In the absence of special factors, any compound on being first formed in the language will almost certainly be given double stress. If it establishes itself in regular use and comes to be regarded as a recognized compound the tendency will be to give it single stress provided there are no strong reasons for conserving the stress on its second component. Single stress is particularly likely to be introduced if there is a sense of contrast implicit in the first component or if the meaning of the compound differs radically from that of the second component when this is used alone. It is then possible that the same components may form a new collocation (combination) which will have a more literal meaning and which will generally preserve its double stress". Consider the following examples:

I. **Noun & noun:**

(*a*)	brass hat	(hat made of brass)
	brass hat	(army staff officer).
(*b*)	chip basket	(made of chips).
	chip basket	(to hold potato chips).
(*c*)	copper plate	(made of copper).
	copper plate	(fine hand writing).
(*d*)	leather jacket	(made of leather).
	leather jacket	(cranefly larva).
(*e*)	paper bag	(bag made of paper).
	paper bag	(bag for containing paper).
(*f*)	paper boy	(model made of paper).
	paper boy	(news vendor).

In all the six pairs of compounds given above it is the difference in the

allocation of stress that relates to the corresponding semantic difference. The first part of each pair is marked by a high static stress on the first component and a kinetic stress on the second component, while the second part of each pair is marked by a kinetic stress on the first component and low static stress on the second component.[4]

II. The following pairs also behave similarly :

(*a*)	bald head	(head without hair).
	bald head	(person without hair).
(*b*)	cross word	(angry word).
	cross word	(type of puzzle).
(*c*)	dark room	(one that is dark).
	dark room	(for photography).
(*d*)	hot cake	(any cake that is hot).
	hot cake	(American pan cake).
(*e*)	tall boy	(boy who is tall).
	tall boy	(piece of furniture).
(*f*)	French master	(who is French).
	French master	(who teaches French).

III. ing form & Noun :

Swimming bath	(bath full to overflowing).
Swimming bath	(bath for swimming in).

So far attention has been drawn to the common stress—patterns of English language which correspond more or less to the basic rhythmic patterns, the proper understanding and description of which is the primal concern of scansion or metrical analysis. The poetic line is divided into various segments or 'feet' and the feet are described in relation to the various stress 'patterns characterizing them. This analysis may be conducted much more scientifically and accurately if the student has equipped himself with a knowledge of the usual, and in many cases fixed, stress patterns of English language. Without this basic equipment he will be seriously handicapped. Therefore a brief treatment of the commonly occurring feet of English poetry is given below. Casual reference is also made to some of the very-uncommon feet for two reasons. Firstly they

are usefully employed in the analysis of the lines given below; and secondly their relevance to the general principles of metrical analysis is indisputable. They will be mentioned one by one in their order of preference or common occurrence. The most common foot is the 'iamb' which closely approximates to the speech rhythm of English language. The iamb comprises an unstressed syllable followed by a stressed syllable; then come the trochee, the anapaest and the dactyl. The 'trochee' is a stressed syllable followed by an unstressed syllable i.e., the reverse of the iamb. The 'anapaest' is two unstressed syllables followed by one stressed syllable and the 'dactyl' is the reverse of the anapaest e.g., one stressed syllable followed by two unstressed syllables; 'spondee' is a two-syllable foot, both of which are fully stressed. There are other feet, however, which are not commonly applied. There is 'brach' which has one unstressed syllable and two stressed syllables and 'anti-brach' which has two stressed syllables followed by one unstressed syllable. The 'amphibrach' is one stressed syllable sand-witched between two unstressed syllables; the 'pyrrhic' is a two syllable foot both of which are unstressed. These are only a few of the possibilities arrived at through analysing the following poetic lines :

(*i*) Season of mists and mellow fruitfulness.

(*ii*) The word is charged with the grandeur of god.
It will flame out, like shining from shook foil;
It gathers to a greatness, like the ooze of oil.
Crushed ; why do men then now not reck his rod?
Generations have trod, have trod, have trod;
And all is seared with trade; bleared, smeared with toil;
And wears man's smudge and shares man's smell,
Is bare now, nor can foot feel, being shod.

(*iii*) Out of the cradle endlessly rocking.

(*iv*) Black town, beige woods, green frozen creek.

(*v*) Up the airy mountain,
Down the rushy glen,
We daren't go a hunting.
For fear of little men,

Wee folk, good folk,
Trooping all together.
Green Jacket, red cap,
And white owl's feather.

One very rarely comes across a line which is hundred per cent lambic, or tro-chaic or dactylic. We can talk only in terms of predominating feet or metre. (*i*) Given above is the opening line of Keat's poem *Ode to Autumn* which is generally considered an lambic line. The line, however, is only predominantly iambic because the initial foot is trochaic. The stress pattern of the word 'season' is predetermined. No matter in what context the word occurs, it will always be stressed on the first syllable. And any dissyllabic structure bearing stress on the first syllable is a trochaic foot, and not an iambic one. The stress can be transferred to the second syllable only when one mispronounces the word. This is true of many poems which are prevailingly iabmic. The Hopkin line is a fifty-fifty case. The first two feet are iambic and the second two feet are anapaestic. This is one way of analysing the line. The other way would be to read the first two feet as iambic, the third foot as pyrrhic, the fourth as trochaic and the fifth as iambic again. The first way is certainly better than the second one because it is common and familiar. But the only way to know this is through exploring all the theoretical possibilities of analysis and then sticking to the one that serves best to bring out the inherent rhythm of the line. There is no other satisfactory way of doing this. In the fourth line of the Hopkin's poem it is theoretically possible to stress almost every word and therefore rendering the line into spondees would certainly lend an emphatic effect which the poet has, perhaps, intended to create. A better analysis of the whitman's (*iii*) would be to read the first two feet and the last two feet as dactylic and tro-chaic respectively. The (*iv*) comprises eight syllables of which the first three feet are spondees and the last one is iambic. The last stanza is a real mixture. It makes use of almost all the metrical feet mentioned above. The stanza has eight lines and comprises twenty feet 'in toto'. The first line is trochaic and comprises three feet; the second line has two feet, the amphimac alternating with the trochaic; the third line has three feet,

the first two being iambic and the last being amphibrach; the fourth line is an iambic line consisting of three feet; the fifth line contains two spondees; the sixth line contains three trochees; the seventh line has one spondee alternating with one braech; and the eighth line comprises one iambic and one antibraech foot. Out of the twenty feet seven are trochees, six are iambs, three spondees, one antibraech, one braech, one amphibrach and one amphimac; and this is certainly appreciable that most of this metrical variety in English poetry is due both to lexical and syntactical stress, though it may be remembered that stress is only one dimension of metrical analysis and for a fuller appreciation of scanning English poetry, recognition of the pitch differences and other accentual features is of utmost significance.

FOOTNOTES

1-2. The terms are borrowed from Kingdon's book. *The Ground Work of English Stress.*

3. When the difference in the incidence of stress relates to a difference in its grammatical function, the stress is termed 'functional'.

4. In English speech rhythm kinetic stress cannot be followed by high static stress (Kingdon).

THE SCIENTIFIC METHODOLOGY IN ISLAM

DR. AMANULLAH KHAN

Asia has been the cradle of great civilizations of the world, and the various peoples of this part of the Globe have been making valuable contribution to the world civilization. The Russians, the Chinese, the Turks, the Afghans, the Arabs, the Persians and the Indo-Pakistanis—the Muslims and the Non-Muslims, have been serving the noble cause of Science and Civilization. In the middle ages, however, the Muslims have been in the vanguard of the caravan of civilization, and they were the real standard bearers of science and learning. George Sarton the renowned author of the "Introduction to the History of Science," says :

"The ninth century was essentially a Muslim Century. To be sure, intellectual work did not cease in other countries far from it, but the activity of the Muslim Scholars and men of science was over-whelmingly superior. They were the real standard-bearers of civilization in those days. Their activity was superior in almost every respect. To consider only the first half of the century, the leading men of science, al-Kindi, the sons of Musa, al-Khawarizmi, al-Farghani were all Muslims."[1]

"The overwhelming superiority of Muslim culture continued to be felt throughout the tenth century. Indeed, it was felt more strongly than ever, not only because the formost men of science were Muslim, but also because cultural influences are essentially cumulative. By the beginning, of or at any rate by the middle of the century, the excellence of Muslim Science was already so well established, even in the West, that each new Arabic work benefited to some extent by the prestige pertaining to all. To be sure, other languages, such as Latin, Greek, or Hebrew were also used by scholars, but the works written in those languages contained nothing new, and in the field of science, as in any other, when one ceases to go forward, one already begins to go backward. All the new discoveries and the new thoughts were published in Arabic. Strangely enough the language of the Qur'an had

thus become the international vehicle of scientific progress".[2]

"The renewal of activity which characterized the second half of the tenth century, continued with greater intensity during the first half of the eleventh century . . . .

To come back to the period under consideration, it would not be too much to say that it marked the climax of the mediaeval thought. The great leaders were so many—Ibn Yunus, Ibn al-Haitham, al-Biruni, Ibn Sina, 'Ali Ibn-'Isa, al-Kharkhi, Ibn Gaberol (all Muslims except the last, who was a Jew)—that, for a moment at least, the historian in bewildered."[3]

This overwhelming superiority of Muslim culture and excellence of their scientific contribution served the noble cause of opening new vistas of literary, scientific and philosophical progress for entire human society—Eastern and Western.

The Muslim Science and cultural has influenced the Western Science and society so much so that an objective and just Western Scholar, like Briffault said :

"It is highly probable that but for the Arabs (Muslim) modern European civilization would never have arisen at all. It is absolutely certain that but for them, it would not have assumed that character which has, enabled it to transcend all previous phases of evolution. For although there is not a single aspect of European growth in which the decisive influence of Islamic Culture is not traceable, nowhere it is so clear and momentous as in the genesis of that power which constitutes the paramount distinctive force of the modern world and supreme source of its victory—natural science and the scientific spirit."[4]

Robert Briffault further observes :

"The debt of our science to that of the Arabs does not consist in startling discoveries or revolutionary theories; science owes a great deal more to Arab culture, it owes its existence. The ancient world was, as we saw, pre-scientific. The astronomy and methematics of the Greeks were foreign importation never thoroughly acclimatized in Greek Culture. The Greeks systematized, generalized and theorized, but the patient ways of investigation, the accumulation of positive knowledge, the minute methods of science, detailed and prolonged observation, experimental inquiry, were altogether alien to the Greek temperament . . . . What we call science arose in Europe as a result of a new spirit of 'inquiry, of new methods of, investigation, of the method of experiment, observation, measurement, of the development of mathematics, in a form unknown to the Greeks. That spirit and those methods were introduced into the European World by the Arabs."[5]

The aim of the writer is not to dwell upon the glories and achievements of the mediaeval past, rather his sincere effort is to explore and rediscover those creative factors which were responsible for this extraordinary scientific and cultural activity of the East including central Asia.

Most of the historians of Science and scholars of human culture agree that the secret of scientific creativity and progress of the West lies in the application of Scientific method, and that the major cause of stagnation of the Eastern society is its failure to continue its application.

In the words of Allama Iqbal the birth of Islam was the birth of inductive intellect[6] and that the point to note is the general empirical attitude of the Qur'an which engendered in its followers a feeling of reverence for the actual, and ultimately made them the founders of modern science. It was a great point to awaken the empirical spirit in an age which renounced the visible as of no value in man's search after God,[7] and that it is a mistake to suppose that the experimental method is a European discovery. Europe has been rather slow to recognize the Islamic Origin of her scientific method.[8]

It would, therefore, be quite appropriate, interesting and inspiring to throw light on the scientific methodology in Islam.

Science and the Scientific Method

The word 'Science' is derived from the Latin Word 'Scientia', which means learning or knowledge. But in general usage a more restricted meaning has been adopted, which differentiates science from other branches of accurate knowledge. The summary of the definitions of science adopted or devised by different scientists of repute is as follows :

(*i*) That science is an ordered, systematized and organised positive

knowledge of nature and physical world.

(*ii*) That this systematized knowledge is derived from observation, a careful study and reflection, and experimentation carried on to determine the nature and principles of what is being studied.

(*iii*) That science is essentially a system, but not a closed system, rather always subject to revision.

(*iv*) That science is not a being but becoming. Thus the love of science is not the love of this or that system, which is bound sooner or later to be superseded by a better one, but simply the love of truth.[9]

The Scientific Method in the language of philosophy and science would mean as follows :

It is an investigative procedure which involves the application of the principle of logic to the solution of scientific problems. In its ease of adaptability to all the sciences, logic becomes the common denominator and reasoning tool of scientific method, with observation and experiment the means of verification of the theories thus advanced.[10] Thus observation, reflection and formation of hypothesis, experiment, knowledge and application of the law of causality, and interpretation and formation of concepts and theories are essential bases of the scientific method.

Observation

Observation is considered to be the starting point of all sciences, and science would not have progressed as rapidly as it has, had investigation depended entirely on chance observations of a simple looking at things. The great strides forward were made after simple or ordinary observation was supplemented by systematic and controlled observation.

In its strict sense the term observation signifies a 'taking note' of something seen, heard, felt, tasted, smelled, or given in some other way as an irreducible element in our own experience.

In an ultimate sense, all observations, if they are to be of significance for science, must be reducible to observation in the strict sense, i.e., to immediate sense impressions.

The accuracy and fruitfulness of our observations depend, further-more,

upon the knowledge we have in the field of observation, e.g., a layman looking at a complicated machine sees a chaos of wheels, wires, tubes, and dials, the engineer sees the functionally interacting parts of the machine.

Senses are not always dependable, but may deceive us at critical moments. So our observation must be checked, against the observations of others.

The employment of instruments not only supplements our senses but also preserves records of what has occured.

Experiment

Experiment is one of the most potent tool of many of the sciences, both for the discovery of new facts, and for more adequate understanding of the existing facts.

The term experiment means an act or operation carried out under conditions determined by the experimenter (as in a laboratory) in order to discover some unknown principle or effect, or to test, establish, or illustrate some suggested or known truth.

The advantage of experiment over observation is that the former makes possible a more reliable analysis, in that the observer may repeat the experiment over and over again at will and thus greatly lessen the possible error of his determination. Similarly, the investigation may be more or less easily divided into parts, thus facilitating the research and making possible more accurate inference as to the connection between various phases of experiment.

John Stuart Mill considers experiment as an immense extention of observation and affirms that observation without experiment (supposing no aid from deduction) can ascertain sequences and co-existences, but cannot prove causation.[11]

The Nature and Use of Hypothesis

We may define hypothesis as an untested theory or a proposition tentatively assumed in order to draw out its logical or empirical consequences and so test its accord with facts that are known or may be determined. The use of hypotheses in the formation of scientific concepts and theories can hardly be over-emphasised. Without such

assumptions science could never have attained its present state, these are necessary steps in the progress to something more certain; and nearly everything which is now theory was once hypothesis.

The Law of Causality

The knowledge of cause and effect of a given phenomena is considered to be the chief objective of all Inductive Logic, and its determination leads to the reliable knowledge of phenomena. The importance attached by J. S. Mill to the Law of Causality can fairly be judged from his following statement:

"If we could determine what causes are correctly assigned to what effects, and what effects to what causes, we should be virtually acquainted with the whole course of nature ....

To ascertain, therefore, what are the laws of causation which exist in nature, to determine the effects of every cause, and the causes of all effects,—is the main business of Induction."[12]

Interpretation and Formation of Concepts and Theories

Observation, experimentation, inductive generalization, etc. the various aspects of scientific method are no doubt, the essential parts of the scientific inquiry, yet they do not constitute the whole of scientific method. In a sense they are preliminary steps for the real task of science, the interpretation, explanation and implementation of experiment.

The following observations of Prof. W. H. Werkmeister on the above subject are note-worthy:

"The initial objects with which scientists are concerned are the objects of perceptual experience, the things and events in the world about us, man himself included. The first steps in scientific procedure are all concerned with obtaining an accurate description or quantitative account of these things and events. The next step is the formulation of law which links various events together in cause and effect relationship and which provides the basis for an explanation. The final step is the interrelation of the laws in one integrative system which provides the maximum unity of knowledge and most adequate explanation of the facts. Such an integration of experience in terms of laws is possible only through precisely defined

concepts. Concept formation and the proper employment of concepts are, therefore aspects of scientific method."[13]

The Qur'anic Concept

The holy Qur'an has been the basic source of guidance and inspiration for the Muslim of all times. It was under the impact of the Qur'anic teachings that arose the method of observation and experiment. Its frequent appeals to human intellect and reason with such injunctions as declare the necessity and importance of keen and profound observation, reflection, foresight, investigation, research and inquiry and utilization of all the senses in search after truth, made its adherents the real servants and founders of modern science.

A few such verses are quoted below:

(*i*) "In the creation of the heavens and the earth and the alternation of the night and the day, there are surely signs for men of understanding. Those who remember Allah standing and sitting and (lying) on their sides, and reflect on the creation of heavens and earth."[14]

(*ii*) "In the creation of the heavens and the earth, and the alternation of night and day, and the ships that sail on the sea with that which profits man, and the water that Allah sends down from the sky, then gives life therewith to the earth after its death and spreads in it all (kinds of) animals and the changing of winds and the clouds made subservient between heaven and earth, there are surely signs for a people who utilize their reason."[15]

(*iii*) "He it is Who sends down water from the clouds for you; it gives drink, and by it (grow) the trees on which you feed. He causes to grow for you thereby herbage, and the olives, and the date palms, and the grapes, and all the fruits. Surely there is a sign in this for a people who reflect. And He made subservient for you the night and the day, the sun and the moon. And the stars are made subservient by His command. Surely there are signs in this for a people who utilize their reason. And what He has

created for you in the earth is of varied hues. Surely there is a sign in this for a people who are mindful."[16]

(*iv*) "And follow not that of which thou hast no knowledge. Surely the hearing, the sight and the heart (the avenues of knowledge), of all these it will be asked."[17]

(*v*) "Is, then, he who goes prone upon his face better guided or he who walks upright on a straight path? Say: He it is Who brought you into being and made for you ears and eyes and heart (so that you may utilize these senses in a better way). Little thanks it is you give."[18]

(*vi*) "Surely the vilest of beasts in Allah's sight are the deaf, the dumb who do not utilize their reason."[19]

(*vii*) "And He has made subservient to you whatsoever is in the heavens and whatsoever is in the earth, all, from Himself. Surely there are signs in this for a people who reflect."[20]

(*viii*) "We will soon show them our signs in the farthest regions and in themselves, until it is quite clear to them that it is the truth."[21]

Again and again the Qur'an lays stress on observation and reflection—observation of the natural phenomena and the observation of the biological nature of animals and the physical nature of the heavens and earth, and says:

(*i*) "Say, observe what is in the heavens and the earth."[22]

(*ii*) "Will they not regard the camels, how they are created? And the heaven, how it is raised? And the hills, how they are set up? And the earth, how it is spread?"[23]

The believers have also been advised to discover the laws of nature. The Prophet of Islam (peace be upon him) is reported to have prayed constantly, "God grant me knowledge of the ultimate nature of things."[24]

Inspired by such Islamic teachings the Muslims set out in the name of God to aquire knowledge, to observe, to reflect, to investigate, to inquire, to experiment and to implement. The Muslim civilization gave birth to a galaxy of universal figures of science. Under the impact of this civilization Central Asia also produced such genius and international personalities of

Science as have left indelible marks on the history of science and learning. A few of such personalities are enumerated below:

(1) Jabir Ibn Hayyan al-Tusi (721-815 A.D.)
(2) Muhammad bin Musa al-Khwarazmi (d. 863 A.D.)
(3) Muhammad Ibn Zakariya al-Razi (c. 865-925 A.D.)
(4) Abu Nasr al-Farabi (born at Rai) (870-950 A.D.)
(5) Abu 'Ali al-Husain Ibn Sina (980-1037)
(6) Abu Raihan al-Biruni (973-1051 A.D.)
(7) Abu Hamid al-Ghazzali (1058-1111)
(8) Umar Khayyam (1038-1048—1123-1132 A.D.)

Each one of them was the prince of the scientists of his age. Jabir Ibn Hayyan, the author of dozens of books on various branches of science, is an accepted founder of modern chemistry. The inventor of so many acids, fully realized the importance of experiment and said:

"The most fundamental and essential thing in Chemistry is experiment. The man who does not found his knowledge on experiment, always goes astray... The greatness of an al-Chemist does not lie in it that what has he studied, rather in the fact what has he proved by his experiments."[25]

Al-Khwarazmi, the author of the first systematic work on al-Gebra, namely "Al-Jabr wal-Muqabalah", which also gave this name to this new science in East and West, was not only the father of al-Gebra, but the first outstanding Muslim mathematician, a note-worthy geographer and an extraordinary astronomer.

Muhammad Ibn Zakariya al-Razi, the Latin Rhazes, is the greatest clinical physician of Islam, well known in both the East and the West. He is the renowned author of the medical work al-Hawi. His masterpiece being "The Treatise on Small Pox and Measles", which was read in medical circles until modern times. He was an undisputed master in medicine and chemistry.

Abu Nasr al-Farabi, termed as Mu'allim-i Thani (the second Teacher), was the first person in Islam to classify completely the sciences. The author of about seventy works on various sciences, had surpassing excellence

in logic, physics, mathematics, etc., in addition to his complete skill in ethics, philosophy and political science. Later historians record his having known nearly every language.

Ibn Sina and Abu Raihan Al-Biruni are so well known to the entire human world that we need no further explanation.

Abu Hamid al-Ghazzali, the author of more than fifty books has left so profound a mark on the intellectual and scientific life of Islam, that no account of the history of Islamic Science can be complete without the discussion of his role.

Umar-i Khayyam, generally known as a famous Persian poet, was also among the greatest scientists of the mediaeval period. He was a great mathematician. He contributed the most important work named 'Algebra', reformed the calendar, known afterwards the Jalali calendar, being more accurate than the Gregorian. He also wrote on Geometry and Physics.

Causes and Circumstances that resulted in above Scientific Activity

(*i*) The major cause as has been seen above was the religious incentive.

(*ii*) Islamic Teachings created scientific spirit among its followers. Consequently they applied the scientific method in the various fields of knowledge.

(*iii*) Political dominance and independence of the East also contributed to the above activity.

(*iv*) Patronage of learning and the learned and respect for the dignity of the Scholars was another source of this momentous scientific movement.

(*v*) The great centres of learning, the libraries, the literary and scientific discussions, journeys in quest of knowledge and the established tradition of learning also contributed a lot in this respect.

(*vi*) Economic self sufficiency is another great factor which according to Ibn Khaldun is responsible for the devotion of a people to the cause of learning.

Causes of Stagnation

The study of the Qur'an, Ibn Khaldun's 'Muqaddimah,' George Sarton's 'Introduction to the History of Science' and Toynbee's 'A study of

History,' reveals the following causes of stagnation of not only of central Asia, East, but of the nations and civilizations of the world:

1. Abandonment of effort, endeavour, striving and hard work. The holy Qur'an says: "God never changes the lot of a people, unless they change themselves", and that man is going to get nothing except for which he strives.
2. Failure to fulfil one's responsibilities to the Creator and the creation.
3. Slothfulness, sluggishness and negligence.
4. Indulgence in luxurious enjoyment of life.
5. Failure to employ the scientific method.
6. Failure to extend proper encouragment to the talent.
7. Ceasing of creativity, failure of the creative minority to provide leadership and guidance in various fields of life and learning, hence loss of its hold on society.
8. Political subordination.
9. Economic insufficiency.
10. Great misfortunes, such as the invasion of the barbarians and great wars. Dr. Hamidullah says: "Muslims continued their work in the service of science until great misfortunes afflicted their principal intellectual centres, Baghdad in the East, and Cordova, Granada in the West. These were occupied by the barbarians, to the great misfortune of science, at a time when the printing press had not yet come into vogue; the burning of libraries with their hundreds of thousands of MSS. led to untold loss. The whole-sale massacres did not spare the learned. What had been constructed in the course of centuries was destroyed in days. Once a civilization declines, due to such calamities, it takes several centuries of time as well as numerous resources, including the facilities to study the achievements of others—who should have assumed the relay after the fall of the previous standard bearers of civilization,—before one can make up the distance."[26]

The Cure

The cure lies in the eradication and elimination of the causes of decay and stagnation. Now that almost all the countires of Central Asia are independent, having enormous manpower to better their economic conditions, the following suggestions are made in connection with the advancement of scientific learning :

1. Concrete steps should be taken to introduce the people of this area to their legacy in the above field. A co-ordinated effort of setting up Academies and centres for the revival of mediaeval learning can prove very fruitful. It is encouraging that a start has already been taken.
2. Frequent discussions, seminars, conferences can also be helpful in eliminating lethargy and in the rediscovery of more creative factors, and also in re-establishing the confidence of the peoples of this area.
3. Study of modern sciences, comparison and contrast of the mediaeval, modern, Eastern and Western Sciences can also serve the above noble purpose.
4. All the media of information and diffusion of knowledge should be fully utilized in infusing among the people the creative and reflective spirit and the spirit of inquiry, investigation and research.
5. Accelerated patronage of learning and research, encouragement and respect for the talent and the learned can be helpful in the creation of a class of scholars and scientists, who can play the role of creative minority.
6. Islamic incentive, once again can work the same miracle, as it worked during the hey days of mediaeval civilization. Moreover reason based on revelation can only adorn humanity with real human values.
7. Coordination and pooling of resources of the various groups of this area for the advancement of science and learning can also be beneficial.

FOOTNOTES

1. George Sarton, *Introduction to the History of Science* (Washington, 1950), i, p. 543.
2. *Ibid.*, p. 619.
3. *Ibid.*, p. 693.
4. Robert Briffault, *The Making of Humanity* (London, 1928), p. 190.
5. *Ibid.*, p. 191.
6. Allama Muhammad Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* (Lahore, 1965), p. 120.
7. *Ibid.*, p. 74.
8. *Ibid.*, p. 129.
9. (*i*) *Webster's New World Dictionary* (1957), World 'Science'.
   (*ii*) McGraw-Hill Encyclopedia of Science & Technology (U.S.A., 1960).
   (*iii*) Encyclopaedia Britannica (1950) xx, p. 115.
   (*iv*) Sarton, *op. cit.*, i, pp. 24-25.
10. Cf. The Encyclopedia Americana (U.S.A., 1961), iv, p. 418.
11. Cf. John Stuart Mill, *A System of Logic, Ratiocinative and Inductive* (London, n.d.), ii, pp. 430-31.
12. *Ibid.*, ii, p. 415.
13. Collier's Encyclopedia (New York, 1958), xvii, p. 407 E.
14. *Al-Qur'an*, 3 : 189-90.
15. *Ibid.*, 2 : 164.
16. *Ibid.*, 16 : 10-13.
17. *Ibid.*, 17 : 36.
18. *Ibid.*, 67 : 22-23.
19. *Ibid.*, 8. : 22.
20. *Ibid.*, 45 : 15.
21. *Ibid.*, 41 : 53.
22. *Ibid.*, 10 : 101.
23. *Ibid.*, 88 : 17-28.
24. Cf. *Reconstruction of Religious Thought*, p. 3.
25. Jabir Ibn Hayyan, *Kitab-al-Tajrid* (Paris, 1928), p. 4.
26. Dr. Hamidullah, *Introduction to Islam*, (Karachi, n.d.), pp. 196-97.

NATIONAL LANGUAGE POLICIES AND STANDARD OF ENGLISH IN PAKISTAN

MUHAMMAD ISMAIL BHATTI

English is taught as a second language in Pakistan but general competence in it, especially in view of investment in terms of human and material resources, is so poor that it is gradually becoming a major national scandal. In this age, when language teaching industry has become so efficient and technically complex, turning out thousands of young people with hopelessly inadequate knowledge of a language which enjoys such important position in our education is an inexcusable lapse. If students are not trained to use the medium of instruction effectively, it is impossible to communicate any knowledge to them and to instruct them to develop thinking habits. Without efficient mastery of language no sound results may be imagined in education. Any teacher who has had a chance to examine examination papers finds that a large majority of the students are entirely dependent on cramming and show no critical ability in discussing their subjects.

There are reasons to believe that language policies in Pakistan have not been quite clear and that the policy-makers could not take into account the political and cultural atmosphere created by freedom. A newly independent nation very naturally aspires to national identity and cohesion, for which the services of a common and developed language are indispensable. In the absence of a written and developed national language, as is the case in some African countries, a foreign language is the only solution. But if the national language is reasonably developed and is felt to be adequate to the purposes of private and community business then the second language is bound to lose ground in its favour. Now Urdu, which is the national language of Pakistan, is very widely used for nearly all purposes : it is used in official work, as medium of instruction, for commercial purposes, and as the language of the mass media, and all these roles it has snatched from English. This increasing influence of Urdu has naturally weakened the

claim of English as the sole monopolist in the fields of education, administration and cultural life. The consequences of imposing a foreign language on a free community were studied by a British linguist, Mr. R.B. Le Page. He writes, "Any community which is governed through the medium of a language other than its own feels itself to be to a certain extent disenfranchised, and this feeling, even though latent, is always a potential focus for political agitation."[1]

Foreign linguists often make a mistake whenever they discuss the status of English in the former colonies. Many of them try to see, in spite of divergent facts, the same causes operative in all Asian and African countries. The real position is that English has enhanced its prestige in some African states where there are no written languages, or where no one native language could serve as the medium of instruction, or as the official language. But in a country like Pakistan, where English came as a result of imperialism and where there is a fully developed language used for a variety of purposes, English could not hope to enjoy, as it did in the pre-Independence period, the status of other than a second language. This factor has not been taken into account by linguists and educationists, who are more concerned with the formal aspects of language teaching and ignore the element of motivation. The strong nationalist sentiments turn against every foreign element which reminds them of political subjugation. After Independence, the people in general developed a complex attitude to English. We may call it love-hatred attitude. On the one hand, the public mind is hostile to English, because it is a remnant of imperialism and is not conducive to our national aspirations, and on the other hand, we stick to it. The westernized class hold that since English is an international language and is used by two of the most advanced nations of the world, so we must retain it and give it a status of primacy over other languages of the country. Sometimes a politician or a scholar may be discovered speaking for and against English from two different platforms. This ambivalent attitude towards English has weakened motivation for learning English and standards have fallen lamentably.

At the moment, we discover among students an attitude of resistance

to second language acquisition. After having discussions with teachers and students of English, and the study of language controversies in the Urdu Press, I have reached the conclusion that because our views about English as language of instruction and of official business are not clear so the motivational component is not taken into account while discussing its teaching and learning. There is no active response from the students because they have no sound reason to learn the language, except that books are available in it. This trend has created a strange ambguity in the minds of the teachers and the students, and the result is that now minds are not clear even regarding the utility of English. It is not enough to say, as has been repeatedly said, that it is an international language and must be studied. It is unnatural to assign to an international language the role that a national language plays in the life of a free nation.

The first Education Minister of Pakistan, Mr. Fazlur Rehman, is quoted to have made the following observations on the language issue: "His own suggestion was that the provincial language should be used as media of instruction and that Urdu be taught in all the Provinces of Pakistan.[2] About English he opined that English could not be given up because of its international importance and also because it is the repository of science and knowledge. He was aware of the injurious effects of making an alien language the medium of instruction."[3]

Dr. I. H. Qureshi, an eminent educationist and a former Minister for Education, was closely associated with education policies after Independence, and his views on the need and place of English in our national life reflect popular sentiments. Although he shared Fazlur Rehman's nationalist sentiments, yet he seems to be opposed to the myth that if English is ousted as medium of instruction, standards of education would fall. In his opinion our students' "command of the foreign language (English) which is medium of instruction as well as examination is so poor that acquisition of real knowledge and its display both are beyond his reach."[4]

Commenting on another myth, he says "the idea that English is indispensable for science education is unfounded."[5]

Dr. Qureshi's views indicate an attitude in the country in the presence

of which total reliance on English for purposes of higher education cannot be prolonged any more. This implied confidence in the ability of Urdu to become the medium of instruction combined with the suspicion that the omnipresence of English is a harmful factor, has weakened the motivational component in the teaching and learning of English as a second language.

Now we turn to the actual problem, the situation created by the language policies in Pakistan. Teaching and learning English operations have been seriously handicapped by the National language policies since Independence. The new nationalist consciousness stimulated hostility towards the legacies of foreign domination, and since the new nation had strong ideological orientation during the freedom struggle, it was quite natural to turn against cultural and intellectual factors which were felt to be inimical to a sense of national identity. Thus, a controversy about the medium of instruction and the language of official business engaged the minds of the intelligentsia of the country and the combatants spoke for and against English. Theoretically, the balance is in favour of Urdu, the national language of the country, but English is still entrenched firmly in the Government offices, higher courts and the universities of Pakistan. Most surprising of all, the educated people speak for and against English in the same breath. They hold that English as a medium of instruction at the college and university level has caused deterioration of standards, it has suppressed creative thinking and has harmful cultural influence, which is not at all good for our cultural and intellectual growth. On the other hand, it is claimed that in spite of all this it is indispensable, because it is an international language and makes vast resources of knowledge, especially science and technology, available to us.

The story does not end here. The people belonging to all walks of life regard English as a symbol of prestige. Much private and official correspondence is done in English. Cash memoes, bills, vistiting cards, files, sign boards, progress reports, advertisements, trade marks and medicine labels, etc., may still be seen in English, which is an indication of its prestigeous status in our society. Observing this situation, one feels as if the people in general see some magic property in the Roman alphabet. May be this is the vestige of a habit older than a century.

This love-hatred attitude towards English has, in fact, muddled the real issue and as a result the English learning situation has constantly deteriorated. Motivation, which is the most fundamental factor in learning a second language, has been weakened by the ambivalent general attitude, the banal shadows of which have fallen on the national language policy. Nearly all governments in Pakistan after Independence have accepted the right of Urdu to replace English as official language as well as medium of instruction at all stages, but practically maintenance of the *status quo* has been the most favoured policy. It is an important psycho-political problem which deserves serious examination, as it is to a great extent responsible for weakening motivation in second language learning.

In the atmosphere of passive resistance or plain hostility, language acquisition processes are bound to suffer a set-back. And if this state of affairs persists along with partial or complete dependence on the target language, the psycho-linguistic dilemma attains an alarming stature. Even a cursory view of our linguistic situation reveals that the teaching and learning of English is reduced to the level of a farce for the simple reason that the second language learning goals are vague and undefined.

In the presence of the British in the South Asian sub-continent, the status of English was clearly defined. All official, legal and academic business was carried out in it. Even the natives aspired to a high level of proficiency and perfection under the strong stimulus of matching the competence of the masters.

A letter of the Court of Directors dated 29th September, 1830, to the Governor General in Council of Bengal says:

"With a view to give the Natives an additional motive to the acquisition of the English language, you have it in contemplation gradually to introduce English as the language of public business in all its departments."[6]

This was, in brief, the policy pursued by the foreign rulers, and it got further consolidated when educational facilities were extended to the remote areas of the country. Even during the freedom struggle, English played an important role. The rulers and the native leaders and intellectuals conducted dialogues and controversies in English, it being the sole medium

of communication for all the parties.

The post-Independence socio-political climate created a new outlook. The Government of Pakistan acting on the recommendations of the special committees set up to review the educational situation, declared in 1954 that English would be replaced by the National languages by 1974. As is well known, this decision has been implemented at all levels, although options to teach and take examinations in Urdu or English exist in the general universities of Pakistan. But this situation was the result of a long arduous struggle, and the supporters of Urdu had to work hard to get room for the national language.

The medium of instruction problem came into the limelight immediately after Independence. The University of the Punjab, the oldest and largest educational institution in the country, started work on the medium of instruction issue and pioneered many revolutionary steps. In 1948, its Syndicate set up a 'Reorganization Committee.' "One of the terms of reference for the Committee was to consider the change of medium of instruction, position of Urdu, English, Persian and Arabic. The Reorganization Committee after a series of meetings, interalia, made the following recommendations:

(*i*) The medium of instruction in all subjects at the Matriculation stage should be Urdu with effect from the examination to be held in 1950 and instruction imparted in Urdu and in all subjects with effect from the classes to be held in 1948;

(*ii*) The medium of instruction and examination in all Arts subjects at the Intermediate, Degree and M.A. stage should be Urdu with effect from the examination to be held in 1950, and in Mathematics and Science subjects with effect from the examination to be held in 1952—it being noted that instruction would start in Urdu in all these subjects with effect from the classes to be held in 1949, in the case of Arts subjects and 1950 in the case of Science subjects."[7]

The Syndicate and the Senate approved the recommendation of using Urdu as a medium of instruction and examination at the Matriculation stage,

but no decision could be made regarding Intermediate and Degree classes.[8]

It was easy to implement the decision at the school level, as text books could be written in Urdu or translated from English at a short notice. The college and University classes posed a serious challenge, and it is here that the policy makers felt shaky. The above quoted report says that "the question of introducing Urdu as medium of instruction and examination at the degree and post-graduate level, as well as in the Professional subjects, however, could not be finally decided . . . ."[9]

This was the period of extreme political instability and social confusion, and no firm decisions could be expected from the Government. But the situation changed in 1958, when the Martial Law regime announced reforms in all fields of national life.

The military officers were much more westernized than the political leaders, whom they had toppled. They began with a bang and caused great stir, but they could not touch the deeper currents of public sentiments. The new regime played up nationalist sentiments, but failed to implement any radical breakthrough in the educational sector. It's language policy was symptomatic of the love-hatred complex. The need of bringing in Urdu and Bengali in place of English was emphasized, and at the same time great stress was laid on retaining English with all its prestige and dominant role.

The language policy envisaged by the National Commission on Education set up by the Martial Law regime says: "While we feel that English must yield to the national languages the paramount position that it has occupied in our educational system so far we are at the same time convinced that English should have a permanent place in that system."[10]

After this unambiguous conclusion, the Report lays down the future language policy:

"We therefore recommend that English should be taught as a compulsory language from class VI to XII in schools and at the graduate level."[11]

This is what has been the actual practice before and after this Report. Although the general tone of this Report was full of nationalist sentiments, yet the emphasis on the old place of English in our educational system betrays a lack of proper understanding of the trends in public thinking.

Moreover, in spite of theoretical straightforwardness, there were in the Report clear indications of ignorance of the apathetic attitude of teachers and students towards English. When the Universities and Boards of Secondary Education introduced Remedial and Functional English courses in place of literature-oriented syllabi, there was universal opposition to this change, and the reasons were not really academic. The teachers and the students took the real purpose indifferently and opposed the practical, dry courses vehemently for being uninteresting and difficult to teach and learn. No one, in fact, cared to analyse the situation at the time and the useful scheme was withdrawn hurriedly and English language courses of colonial days were restored. They are still in use.

Proposals for a New Educational Policy; popularly known as Noor Khan Report (July 1969) visualized drastic changes in education, and their strong nationalistic spirit gave them wide publicity as a revolutionary document. Their analysis of the role and importance of English in our education caught the public imagination and stimulated a debate about the future of English in our education.

The Federal Government framed New Educational Policy on the basis of Noor Khan Report and public comments on it, and published it in March 1970. Views on English are once again unequivocally expressed and the future intentions of the policy-makers show the old uncertainty about the exact place of this language in our education and administration. The New Educational Policy said:

"In recent years, the national language and in some cases the regional languages have progressively replaced English almost entirely up to the secondary level of education. The continued use of English as distinct from the study of English as a language cannot of course be justified as it tends to defeat the basic objectives mentioned above. Even at the higher stages, it encourages cramming without developing the creative and critical powers of mind in the vast majority of students."[12]

The policy makers try to suggest ways and means of coming out of the linguistic difficulty, although their analysis reveals no new facts or concrete programmes. Continuing the same theme, it says: "The question of

changing of the medium at the higher stage of education is, however, closely bound up with that of the replacement of English language for official purposes. Both of these interlinked issues need, therefore to be examined together, and, their full implications worked out so that the change over is easy and smooth."[13]

As we shall see a little later, the prestigeous status and dominance of English as the medium of higher education (now along with Urdu in all the Arts subjects upto M.A. level, and in Science subjects upto B.Sc. level) and as the official language of the Federal Government and partially of the Provincial Governments, has constantly been challenged by intellectuals, educationists and political leaders. What makes the situation so very tense is that English continues to enjoy the pre-Independence status in the presence of Urdu, a developed and rich language spoken and written all over Pakistan. In fact, the formidable presence of Urdu in our cultural and intellectual life has been a constant challenge for the supremacy of English in education and administration. Thus, the insistence upon retaining English and accepting the claims of Urdu has consolidated the linguistic anomaly, which has pestered our education for years and has distracted attention from improving the English learning situation.

Conclusion

The brief review of national language policies given in the foregoing pages was intended to clarify the extremely unfavourable situation in which English is being taught and learnt. It is being studied like a dead language, and that too without a sense of purpose. How could anyone expect even a modest level of proficiency when the teachers and students are uncertain about its future role in the life of their community? In the present psycholinguistic climate of confusion, uncertainty and apathy, greatly created by national language policies, no one wants to get rid of English, or to treat it at par with other foreign languages, for various reasons, but very few learn it with full motivational pressure.

It is commonly observed that a large number of students are afraid of learning English because they find it a difficult and uninteresting subject. The number of teachers who understand the mechanics of language teaching

as well as the problems of their students is very small, and most of them are doing their job with utter indifference to the results they produce. Most surprising of all, no professional forums of school and college teachers of English exist to discuss or sort out the disheartening situation. Off and on, the national press publishes letters and articles on the role and standards of English, but this only adds to the existing confusion. An eminent educationist and most influential exponent of Urdu, Dr. Sayed Abdullah, once called English "an adopted national language of Pakistan"[14] and held that this status was harmful for this language and education in general. Addressing the teachers of English on the opening day of a refresher course, he said:

> "First of all, it may be seen that English is required to play an unnatural role in Pakistan. Instead of making it a second language, it is virtually made the principal and first language of education."[15]

One may suspect that he is overstretching the point. But this is not exactly so. The policy-makers have always ignored the empirical fact of a changed socio-political situation. English could not hope to enjoy the status of the pre-Independence days. Even its role as a second language has not been fully taken into account. Nearly all subjects are being taught, fully or partly, in Urdu as well as in English. The study of English as a separate subject, as a second language, intended to be helpful in advanced learning should have been standardized with minimum investment in terms of human energy and time. Unfortunately, this has not been done. The time has come now to review the situation if wastage of resources on English is to be stopped. The following lines are reproduced from the script of a B.A. candidate who has had nine years of instruction in English as a compulsory subject. Writing about Charles Lamb's essay, *Dream Children*, he says :

> "In this story Charles has no relation only sister. He tried the enjoyed in the dream. He had left alone in the world. One day Charles day dreamed. He talked relashions this house is a grand mother."

This is not an uncommon example, thousands of B.A. students write this sort of stuff. The range of errors our students make is enormous. We

notice a poor grasp of syntactical features of English, misspellings, hopeless vocabulary control, semantic confusion, every time we make a student write some thing in English. This is, undoubtedly, the result of weak motivation.

On the basis of what has been said before, one may conclude that the role of English in education and national life should be redefined in order to standardize its teaching and learning. One of the solutions proposed in letters and articles appearing in the national press is that it should be made an optional subject in general, but for the college and university students going for specialization it should be made compulsory. It is rightly argued that this policy will reduce the number of students in English classes, as only genuinely motivated students will come to them. One may add that if the goals of learning English are defined as clearly as this, even the present inefficient methods would produce better results.[16] The learner must know for what ends he intends to study the subject. The present policy of inflicting English on all without convincing them for what reasons we are doing so, is the chief villain in the language deficiency story.

FOOTNOTES

1. *The National Language Question*, London, 1966, p. 16.
2. By that time only Urdu was considered as the future National language, Bengali came later into the picture.
3. I.H. Qureshi, *Education in Pakistan*, Ma'rif Ltd., Karachi, 1975, p. 33.
4. *Ibid.*, p. 173.
5. *Ibid.*, p. 189.
6. Syed Mahmood, *A History of English Education in India* (1781-1893), Aligarh, 1895, p. 33.
7. M. Bashir, *The Question of Medium of Instruction and Examination at the University of the Punjab*, Lahore, pp. 4-5.
8. *Ibid.*, p. 6.
9. *Ibid.*, p. 7.

10. *Report of the Commission on National Education*, Government of Pakistan, 1962, p. 288.
11. *Ibid.*, p. 289.
12. *The New Education Policy of the Government of Pakistan*, Islamabad, 1970, p. 18.
13. *Ibid.* p. 19. In the Pakistan Provisional Constitutional Order (1972) a recommendation was made to set up a Commission to implement this policy.
14. *The Study and Teaching of English in Pakistan*, inaugural address delivered on May 22, 1962, at the West Pakistan Education Extension Centre, Lahore. I have consulted the typed manuscript in the author's possession.
15. *Ibid.*
16. I am not suggesting that better teaching techniques should not be tried. They are our urgent need.

NOTICE TO SUBSCRIBERS

The two issues of the Journal of the University of the Punjab relating to the Humanities, entitled *Journal of Research (Humanities)*, are published in January and July and the other two issues of the Journal dealing with Sciences, entitled *Journal of Scientific Research*, in April and October. The volumes of *Journal of Research (Humanities)* and *Journal of Scientific Research* are numbered separately.

The subscription, including postage, for a single issue is Rs. 2.50 in Pakistan ($1.00 or 7s.6d. in foreign countries), for two issues in a year of *Journal of Research (Humanities)* or *Journal of Scientific Research* is Rs. 5.00 ($2.00 or 15s.), and annual subscription, including postage, for four issues is Rs. 10.00 ($4.00 or 30s.).

All correspondence should be addressed to Mr. Muhammad Ismail Bhatti, Assistant Professor, Department of English, Secretary, Editorial Board, *Journal of Research (Humanities)/Journal of Scientific Research*, University of the Punjab, Lahore (Pakistan).

Printed by A. R. Minhas at the Punjab University Press, Lahore,
and published by A. Rahim Khan for the University of the Punjab.

CONTENTS

Page

I. اقبال کا اسلوب نگارش

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار 1

II. ARMS SALES AND THE OIL CRISIS

Akmal Hussain 41

III. THE IMPORTANCE OF STRESS IN SCANNING ENGLISH POETRY

Iftikhar Ahmad 57

IV. THE SCIENTIFIC METHODOLOGY IN ISLAM

Dr. Amanullah Khan 67

V. NATIONAL LANGUAGE POLICIES AND STANDARD OF ENGLISH IN PAKISTAN

Muhammad Ismail Bhatti 81